هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ و دین الحق لیظهره علی الدین کله

اسلامی اصول کی فلاسفی

ایک عظیم الشان اور معرکۃ الآرا اسلامی لیکچر

جو

سنہ ۱۸۹۶ء میں جلسہ مذاہب لاہور میں کئی ہزار کے مجمع میں پڑھا گیا۔ جس
میں اسلام کا حقیقی فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ اور جو دیگر تمام
مضامین پر غالب رہا

بار دہم

خاکسار:۔ محمد فخر الدین مالک کتاب گھر قادیان نے شائع کیا

ماہ نومبر سنہ ۳۰ء

تعداد ۴۰۰۰ قیمت ۵/

انٹروڈکشن

دسمبر ۱۸۹۶ء کے بڑے دن کی تعطیلات میں بمقام لاہور ایک جلسہ اعظم مذاہب ع
ہوا جسمیں پانچ مذہبی سوالوں پر تمام مذاہب کے علماء متکلمین نے اپنے اپنے مذہب کیط
سے وکیل ہوکر بڑے زور شور سے تقریریں کیں ۔ مگر ان تقاریر میں سے صرف ایک ہی تقریر ان سو
کا حقیقی اور مکمل جواب تھی ۔ اور دیگر تمام لوگوں کے گوناگون جوابات پر حاوی اور مشتمل تھی
کوئی صداقت یا حقیقت کسی شخص نے بیان نہیں کی ۔ جو اس تقریر میں موجود نہ ہو ۔ اور بے
شمار صداقتیں حقائق اور معارف کی اس تقریر میں ایسے بھرے تھے ۔ جس سے دوسروں کی تقریریں
بالکل عاری تھیں ۔ جس وقت یہ تقریر اسلامیہ کالج لاہور کے بڑے ہال میں حضرت مولوی
عبد الکریم صاحب سیالکوٹی کمال فصاحت و بلاغت کیساتھ پڑھ رہے تھے ۔ اس وقت کا
سماں بیان نہیں کیا جا سکتا ۔ کسی مذہب کا کوئی شخص نہیں تھا ۔ جو بے اختیار تحسین
آفرین کا نعرہ بلند نہ کر رہا ہو ۔ کوئی آدمی نہیں تھا ۔ جس پر وجد اور محویت کا عالم
طاری نہ ہو ۔ کوئی آنکھ نہیں تھی ۔ جو رو نہ رہی ہو ۔ کوئی دل نہ تھا ۔ جو پگھل نہ رہا ہو ۔ جلسہ
اس مضمون کے پڑھنے سے گویا ایک صوفیہ کرام کی مجلس تھی ۔ جہاں سارے دل لذت اور
وجد سے رقص کر رہے تھے ۔ طرز بیان ایسا دلچسپ اور ہر دلعزیز تھا ۔ ہر ایک یہی سمجھتا تھا
کہ گویا میرے ہی مذہب اور خیالات کی حمایت ہو رہی ہے ۔

اس سے بڑھکر اس مضمون کی خوبی کی اور کیا دلیل ہوگی ۔ کہ مخالفین تک عش عش کر رہے تھے
مشہور و معروف انگریزی اخبار سول ملٹری گزٹ نے باوجود عیسائی ہونے کے صرف اس مضمون
کی اعلیٰ درجہ کی تعریف لکھی ۔ اسی کو قابل تذکرہ بیان کیا ۔ دیگر مضامین سے بالکل چشم پوشی کی ۔ اور ہیچ
سمجھا ۔ جیسا کہ اس کی مندرجہ ذیل رائے سے ظاہر ہے ۔

نقل و ترجمہ رائے اخبار سول ملٹری گزٹ لاہور ۹ نومبر سنہ ۱۸۹۶ء

In the religious conference of Lahore held at the Mohammadan College building on the 26th, 27th, & 28th, the following five subjects were elected as the main points to be discussed by the representatives of the various religions.

(1) On mental being its moral and spiritual welfare.

(2) What does the human existence mean, and how its aim can be gained.

(3). The day of resurrection.

(4). What our deeds effect in this world and in the world to come.

(5). How to learn and come to attain knowledge of the supreme being.

Particular interest centred in the lecture of Mirza Ghulam Ahmad of Qadian a master in the apologetics of Islam. All immense gathering of sects far and near assembled to hear the lecture, whicb, as the Mirza himself was unable to attend in person, was read by one of his able scholars, Munshi Abdul Karim Fasih, (the eloquent) of Sialkot. The lecture on the 27th, lasted for about a three and a half hours and was listened to with rapt attention, though so far it dealt only with the first question. The speaker promised to treat the remaining questions if time was allowed, so the presidents and the executive committee reserved to extend their sitting to the 29th.

"جلسہ مذاہب لاہور جو ۲۶ و ۲۷ - اور ۲۸ - دسمبر ۱۸۹۶ء کو اسلامیہ کالج
لاہور میں منعقد ہوا - جس میں مختلف مذاہب کے نمائندوں نے مندرجہ ذیل پانچ سوالوں کا جواب دیا -
(۱) انسان کی جسمانی - اخلاقی - روحانی حالتیں (۲) انسان کی زندگی کے بعد کی حالت یعنی
عقبےٰ (۳) دُنیا میں انسان کی اصل غرض اور اس غرض کی تکمیل کے اسباب (۴) کرم
یعنی اعمال کا اثر دنیا و عاقبت میں (۵) علم یعنے گیان اور معرفت کے ذرائع اور وسیلے +

اس جلسہ میں سامعین کی دلی اور خاص دلچسپی میرزا غلام احمد صاحب قادیانی
کے لکچر کے ساتھ تھی - جو اسلام کی حمایت اور حفاظت کے کامل ماسٹر ہیں - اس لکچر کے
سننے کے واسطے دور و نزدیک سے لوگوں کا ایک جم غفیر ہو رہا تھا - اور چونکہ مرزا صاحب
خود تشریف نہیں لا سکتے تھے - اس لئے یہ لکچر ان کے ایک لائق شاگرد منشی عبد الکریم فصیح
سیالکوٹی نے پڑھ کر سُنایا - ۲۷ تاریخ کو یہ لکچر ساڑھے تین گھنٹہ تک ہوتا رہا - اور
عوام الناس نے نہایت ہی خوشی اور توجہ سے اس کو سُنا - لیکن ابھی صرف ایک
سوال ختم ہوا - مولوی عبد الکریم نے وعدہ کیا - کہ اگر وقت ملا تو باقی کا بھی سنا دوں گا
اسلئے اگزکٹو کمیٹی اور پریزیڈنٹ نے یہ تجویز کر لی ہے کہ ۲۹ تاریخ کا دن بڑھا دیا جاوے" +

چنانچہ ہمارے مضمون کے لئے بخوشی ایک دن اور بڑھا دیا گیا - اور باقی مضمون
بھی سامعین نے اسی ذوق و شوق سے سنا - پنجاب آبزرور نے اس مضمون کی
تعریف و توصیف میں کالموں کے کالم بھر دیئے - پیسہ اخبار - چودھویں صدی
صادق الاخبار مخبر دکن وغیرہ تمام اخبارات بالاتفاق اس مضمون کو تعریف و توصیف
میں رطب اللسان ہوئے - غیر اقوام اور غیر مذاہب والوں نے شرمندہ ہو کر اپنے مضامین کو
ناچیز سمجھا اور اس مضمون کو سب سے بالا تر مانا - والفضل ما شھدت بہ الاعداء

قبل از وقوع جلسہ اعلیٰ حضرت جری اللہ فی حلل الانبیاء میرزا غلام احمد
صاحب قادیانی مسیح موعود و مہدی مسعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک اشتہار
شائع فرمایا - جس میں حضور والا نے اس مضمون کے متعلق خدائے حکیم و خبیر سے خبر پاکر پیشگوئی
فرمائی - کہ یہ مضمون دیگر سب مضامین پر بالا رہیگا - چنانچہ اس اشتہار کی نقل درج کی جاتی ہے -

سچائی کے طالبوں کیلئے ایک عظیم الشان خوشخبری

جلسہ اعظم مذاہب جو لاہور ٹاؤن ہال میں ۲۶-۲۷-۲۸ دسمبر ۱۸۹۶ء کو ہوگا۔
اس میں اس عاجز کا ایک مضمون قرآن شریف کے کمالات اور معجزات کے بارہ میں پڑھا
جائیگا۔ یہ وہ مضمون ہے۔ جو انسانی طاقتوں سے برتر اور خدا کے نشانوں میں سے ایک نشان
اور خاص اُسکی تائید سے لکھا گیا ہے اسمیں قرآن شریف کے وہ حقائق اور معارف درج ہیں جنسے
آفتاب کی طرح روشن ہو جائیگا۔ کہ درحقیقت یہ خدا کا کلام اور رب العالمین کی کتاب ہے۔
اور جو شخص اس مضمون کو اول سے آخر تک پانچ سوالوں کے جواب میں سُنے گا میں یقین
کرتا ہوں کہ ایک نیا ایمان اس میں پیدا ہوگا۔ اور ایک نیا نور اس میں پیدا ہوگا۔ اور
ایک نیا نور اسمیں چمک اُٹھے گا اور خدا تعالےٰ کے پاک کلام کی ایک جامع تفسیر اسکے
ہاتھ آجائیگی۔ میری تقریر انسانی فضولیوں سے پاک اور لاف و گزاف کے داغ سے منزہ
ہے مجھے اس وقت محض بنی آدم کی ہمدردی نے اس اشتہار کے لکھنے کیلئے مجبور کیا ہے
کہ تا وہ قرآن شریف کے حسن و جمال کا مشاہدہ کریں اور دیکھیں کہ ہمارے مخالفوں کا کسقدر ظلم
ہے کہ وہ تاریکی سے محبت کرتے ہیں اور نور سے نفرت کرتے ہیں مجھے خدائے علیم نے الہام
سے مطلع فرمایا ہے۔ کہ یہ وہ مضمون ہے جو سب پر غالب آئیگا۔ اور اسمیں سچائی اور
حکمت اور معرفت کا وہ نور ہے جو دوسری قومیں بشرطیکہ حاضر ہوں اور اُسکو اول سے آخر تک
سنیں شرمندہ ہو جائیں گی اور ہرگز قادر نہ ہونگے کہ اپنی کتابوں کے یہ کمال دکھلا سکیں۔ خواہ وہ
عیسائی ہوں۔ خواہ آریہ۔ خواہ سناتن دھرم والے یا کوئی اور۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے ارادہ فرمایا
ہے۔ کہ اس روز اسکی پاک کتاب کا جلوہ ظاہر ہو۔ میں نے عالم کشف میں اس کے
متعلق دیکھا کہ میرے محل پر غیب سے ایک ہاتھ مارا گیا اور اس ہاتھ کے چھونے سے اس محل میں
سے ایک نور ساطعہ نکلا۔ جو ارد گرد پھیل گیا۔ اور میرے ہاتھ پر بھی اس کی روشنی پڑی۔
تب ایک شخص جو میرے پاس کھڑا تھا۔ وہ بلند آواز سے بولا اللہ اکبر خربت خیبر
اس کی تعبیر یہ ہے کہ اس محل سے میرا دل مراد ہے۔ جو جائے نزول و حلول انوار ہے۔ اور

وہ نور قرآنی معارف ہیں اور خیبر سے مراد تمام خراب مذاہب ہیں۔ جنمیں شرک اور باطل کی ملونی ہے اور انسان کو خدا کی جگہ دی گئی۔ یا خدا کی صفات کو اپنے کامل محل سے نیچے گرا دیا ہے۔ سو مجھے جتلایا گیا کہ اس مضمون کے خوب پھیلنے کے بعد جھوٹے مذہبوں کا جھوٹ کھل جائیگا۔ اور قرآنی سچائی دن بدن زمین پر پھیلتی جائیگی۔ جب تک کہ اپنا دائرہ پورا کرے پھر میں اس کشفی حالت سے الہام کی طرف منتقل کیا گیا۔ اور مجھے یہ الہام ہوا۔

"إن الله معك إن الله يقوم اينما قمت"

یعنی خدا تیرے ساتھ ہے۔ خدا وہیں کھڑا ہوتا ہے۔ جہاں تو کھڑا ہو۔ یہ حمایت الٰہی کیلئے ایک استعارہ ہے اب میں زیادہ لکھنا نہیں چاہتا۔ ہر ایک کو یہی اطلاع دیتا ہوں۔ کہ اپنا اپنا خرچ کرکے بھی ان معارف کے سننے کیلئے ضرور بمقام لاہور تاریخ جلسہ پر آویں۔ کہ ان کی عقل اور ایمان کو اس سے وہ فائدے حاصل ہونگے۔ کہ وہ گمان نہیں کر سکتے ہوں گے ؛

والسلام علی من اتبع الھدیٰ

خاکسار غلام احمدؐ از قادیان - ۲۱ دسمبر ۱۸۹۶ء

یہ زبردست پیشگوئی ایک عظیم الشان اور چمکتا ہوا نشان تھا۔ جو اسلام کی تائید میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ہاتھ پر بموجب آیت قرآنی لیظھرہ علی الدین کلہ کے ظاہر ہوا۔ باطل روند اگیا۔ اور حق چمک اٹھا۔ مبارک وہ جو اس سے مستفید ہو اس پیشگوئی کی تصدیق میں ایک اور شہادت درج ذیل کرتا ہوں۔ وہ شہادت جلسہ مذکور کے پریزیڈنٹ اور رپورٹر صاحبان کی ہے۔ ناظرین کے موازنہ کے لئے ایک کالم میں رپورٹ جلسہ میں سے تمام لیکچراروں کے متعلق پریزیڈنٹ اور رپورٹروں کے ریمارکس اور رائیں۔ اور ان کے مقابل دوسرے کالم میں اعلیحضرت میرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے لیکچر کے متعلق تمام ریمارکس ایک جگہ درج کئے گئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے۔ کہ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ اس مضمون کو بار بار مطالعہ کرو۔ تو روحانی اور آسمانی جواہرات کے خزانے پاؤ گے ؛

خلاصہ ریمارکس از رپورٹ جلسہ اعظم لاہور

ریمارکس متعلقہ دیگر تمام لیکچراران جلسہ

(۱) مذہب (سناتن دھرم)
لیکچرار۔ پنڈت ایشر داس صاحب
ریمارک پریزیڈنٹ × × × ×

(۲) مذہب۔ (اسلام)
لیکچرار۔ مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی
ریمارک پریزیڈنٹ × × × ×

(۳) مذہب۔ تھیوسافیکل سوسائٹی
لیکچرار۔ رائے بڑھا کنٹھ صاحب
پلیڈر ریمارک۔ اردو زبان میں آپکو محاورت نہ تھی۔ انگریزی محاورے کا لفظی ترجمہ کرتے تھے۔ ہر ایک نے نہایت ہی دلچسپی اور ذوق وشوق سے سنا۔

(۴) مذہب۔ (اسلام)
لیکچرار مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری
ریمارک مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری کے محبت بھرے الفاظ آپکو بہت پسند آگئے ہونگے میں اپنی طرف سے اور آپ صاحبان کیطرف سے مولوی صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

(۵)۔ مذہب (آریہ سماج)۔
لیکچرار بابو بیجا رام چیٹرجی سابق پریزیڈنٹ سکھ
ریمارک پریزیڈنٹ۔ بابو صاحب کی تقریر کے مذاقیہ حصے نے لوگوں کو بہت ہنسایا۔

(۶) مذہب (فری تھنکر)
لیکچرار پنڈت گوردھن داس صاحب
ریمارک پریزیڈنٹ × × × ×

(۷) مذہب۔ (اسلام)

ریمارکس متعلقہ مضمون حضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی

"پنڈت گوردہن داس صاحب کی تقریر کے بعد نصف گھنٹہ کا وقفہ تھا لیکن چونکہ بعد از وقفہ ایک نامی وکیل اسلام کیطرف سے تقریر کا پیش ہونا تھا۔ اسلئے اکثر شائقین نے اپنی اپنی جگہ کو نہ چھوڑا۔ ڈیڑھ بجے میں ابھی بہت سا وقت تھا کہ اسلامیہ کالج کا وسیع مکان جلد جلد بھرنے لگا اور چند ہی منٹوں میں تمام مکان پُر ہوگیا۔ اُس وقت کوئی سات آٹھ ہزار کے درمیان مجمع تھا۔ مختلف مذاہب وملل اور مختلف سوسائٹیوں کے معتدبہ اور ذی علم آدمی موجود تھے۔ اگرچہ کرسیاں اور میزیں اور فرش نہایت ہی وسعت کے ساتھ مہیا کیا گیا۔ لیکن صدہا آدمیوں کو کھڑا ہونے کے سوا اور کچھ نہ بن پڑا۔ اور ان کھڑے ہوئے شائقینوں میں بڑے بڑے رؤسا عمائد پنجاب علماء فضلاء بیرسٹر وکیل پروفیسر اکسٹرا اسسٹنٹ ڈاکٹر۔ غرض کہ اعلےٰ طبقہ کے مختلف برانچوں کے ہر قسم کے آدمی موجود تھے۔ نہایت صبر وتحمل کے ساتھ جوش سے برابر چار پانچ گھنٹے اُس وقت ایک

لیکچرار اعلیٰحضرت مرزا غلام احمد صاحب قادیانی
ریمارک پریزیڈنٹ۔ بالمقابل کے کالم میں درج ہیں

(۸) مذہب - (اسلام)
لیکچرار مولوی عبداللہ صاحب ٹونکی
ریمارک پریزیڈنٹ۔ باوجود حسب درخواست
ازادی وقت کے پھر بھی تقریر کیلئے نہ آئے
اور حسب درخواست ان کا وقت مولوی
محمد حسین صاحب بٹالوی کو دیا گیا +

(۹) مذہب (سکھ ازم)
لیکچرار سردار جواہر سنگھ صاحب سیکرٹری
خالصہ کمیٹی لاہور +
ریمارک پریزیڈنٹ۔ تقریر بہت ہی عام پسند
اور برجستہ اور سکھ مذہب کے اصول کے
مطابق مطلب خیز اور مفید تھی۔

(۱۰) مذہب - دھارمنکل سوسائٹی (نظام کلی)
لیکچرار ماسٹر درگا داس صاحب ایڈیٹ وکیٹ ریمارک ×

(۱۱) مذہب (برہمو سماج)
لیکچرار لالہ کاشی رام صاحب سیکرٹری برہمو سماج
ریمارک پریزیڈنٹ۔ ہردلعزیز تقریر۔

(۱۲) مذہب - عیسائیت -
لیکچرار مسٹر مارٹین صاحب ترنسلٹ لاہور ریمارک

(۱۳) مذہب - سناتن دھرم)
لیکچرار - پنڈت گوپی ناتھ صاحب سیکرٹری
ریمارک - بڑی دلچسپی اور محبت کے ساتھ سنی گئی -

(۱۴) مذہب - عیسائیت -
لیکچرار امام الدین مصنف فاتح الکتاب المسلمین
ریمارک یہ تقریر بھی مسلمانوں کی طرف سے ناپسندیدگی کا شور برپا کرے
(۱۵) مذہب - لیکچرار - ریمارکس - آریہ سماج - ماسٹر
درگا پرشاد صاحب پریزیڈنٹ آریہ سماج -
(۱۶) سکھ - سردار جیون سنگھ صاحب ایڈیٹر خالصہ بہادر لاہور

ٹانگ پر کھڑا رہنا پڑا۔ اس مضمون کیلئے اگرچہ
کمیٹی کی طرف سے صرف دو گھنٹہ ہی تھے لیکن
حاضرین جلسہ کو اس سے کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہو
گئی کہ موڈریٹر صاحبان نے نہایت جوش اور خوشی
کے ساتھ اجازت دی کہ جب تک یہ مضمون
ختم نہ ہو تب تک کارروائی جلسہ کو ختم نہ کیا
جائے ان کا ایسا فرمانا۔ عین اہل جلسہ اور
حاضرین جلسہ کی منشا کے مطابق تھا۔ کیونکہ
جب وقت کے گذرنے پر مولوی مبارک علی
صاحب نے اپنا وقت بھی اس مضمون کے ختم ہونے
کیلئے دیا حاضرین اور موڈریٹر صاحبان نے ایک
نعرہ خوشی سے مولوی صاحب کا شکریہ ادا کیا گیا۔ یہ مضمون
شروع سے اخیر تک یکساں دلچسپی و مقبولات
اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ (رپورٹ صہ ۷۹)

"عالیجناب حضرت مرزا غلام احمد صاحب جن کی کل
کی عالمانہ تحریر سے کوئی بھی ایسا نہ تھا۔ جو خوش نہ ہوا
ہو۔ اور اس نے پسند نہ کی ہو" (رپورٹ صہ ۱۵۴)

تقریر سردار جواہر سنگھ صاحب سیکرٹری خالصہ اگرچہ
اس مضمون کے ختم ہوتے ہوتے شام کا وقت آگیا
لیکن یہ ابھی پہلے سوالوں کا جواب تھا۔ اس مضمون سے
حاضرین جلسہ کو بلا استثنا واحد دیگر ایسی دلچسپی ہو گئی
کہ عام طور سے اگزیکٹو کمیٹی سے استدعا کی گئی کہ کمیٹی اس
جلسہ کے چوتھے اجلاس کیلئے انتظام کرے" (رپورٹ صہ ۱۴۰)

فہرست مضامین کتاب اسلامی اصول کی فلاسفی

ا۔ انٹروڈکشن
ب۔ رائے اخبار سول ملٹری لاہور
ج۔ نقل اشتہار پیشگوئی
د۔ خلاصہ یہ مبارک پریزیڈنٹ
۱۔ دعوے اور دلیل الہامی کتاب سے ہونا ضروری ہے
۲۔ سوال اول کا جواب
" اقسام حالات ثلاثہ انسانی
۳۔ پہلا نفس امارہ
" دوسرا نفس لوامہ
۴۔ تیسرا نفس
۵۔ انسان کی طبعی حالتوں پر قرآن کا اثر
۶۔ قرآن کریم شیاروی سکھاتا ہے
۷۔ روح کی پیدائش
۸۔ روح کا مخلوق ہونا
۹۔ روح کی دوسری پیدائش
" انسان کی تدریجی ترقی
۱۰۔ اسلام کی حقیقت
۱۱۔ طبعی حالتوں اور اخلاق میں مابہ الامتیاز

۱۲ جیو ہتھیا کا لطیف رد
۱۳۔ اصلاح کے طریق
۱۴۔ بعثت آنحضرت صلعم کامل اصلاح پر ہوئی
۱۵ قرآن کریم کا مقصد اصلاحات ثلاثہ ہیں
" طبعی حالتیں تعدیل سے اخلاق بن جاتی ہیں
۱۶۔ حقیقی اخلاق
۱۷ خَلق اور خُلق کی تعریف
۱۹ اصلاح اول یعنے طبعی حالتیں
۲۱ نیوگ کی تردید
۲۲۔ تعداد ازدواج کی فلاسفی
۲۳ حرمت خنزیر کی لطیف تشریح
۲۴ انسان کی اخلاقی حالتیں
" اخلاق کے دو قسم
۲۵ اخلاق متعلق ترک شر
" احسان یا عفت کی فلاسفی
۲۷ قرآن میں پاکدامنی کی تعلیم
۲۹۔ پاکدامن رہنے کے پانچ علاج

۲۹ اسلامی پردے کی فلاسفی
۳۰ قرآن میں امانت و دیانت کی تعلیم
۳۱ قرآن کی بے نظیر حکمت بیانی
۳۴ قرآن میں صلحکاری کی تعلیم
۳۵۔ رفق اور قول احسن کی تعلیم
۳۶ ایصال خیر کے اقسام
۳۷ قرآن میں عفو کی تعلیم
۳۸ قرآن میں عدل کی تعلیم
۳۹ نیکی اور احسان کرنیکا احسن طریق
۴۰۔ قرآن کے متعلق ضروری ہدایتیں۔
۴۱ بہشت کی فلاسفی
۴۲ بنی نوع سے ہمدردی کی تعلیم
۴۳ شجاعت
۴۴ سچائی فطرتی خاصہ ہے
۴۵ جھوٹ سے سخت ممانعت
۴۶ صبر کی تعلیم
" مومنوں کیلئے آزمائش ضروری ہے
۴۷۔ ہمدردی خلق

۴۸ بزرگ ہستی کی تلاش
۴۹ ایک لطیف مثال سے شرک کا رد
۵۰ خدا کا الہام اسکی زبردست ہستی کا ثبوت ہے۔
۵۱ الہام الٰہی اب بھی جاری ہے
" عرب میں آنحضرت کی بعثت کی حکمت
۵۲ اسلام ہی کامل دین ہے
۵۳ خدا کی ہستی کے پانچ زبردست دلائل
۵۶ صفات باریتعالیٰ کا بیان
۶۰ قرآن میں میانہ روی کی تعلیم اور حکمت
۶۱ تیسرا سوال روحانی حالتیں کیا ہیں؟
۶۲ مومن کی بہشت دنیا میں بنتی ہے
۶۳ فیوض ربانی کے حصول کے طریق
۶۴ خدا کا وصال دعا سے ملتا ہے
۶۵ سورۂ فاتحہ کی لطیف تفسیر
" خدا کے فیوض کن کو ملتے ہیں

۶۶ استقامت کی حقیقت
۶۷ با خدا بننے کا درجہ
۶۹ مومن کیلئے دو بہشت
۷۰ لفظ زنجبیل کی لطیف فلاسفی
۷۲ خدا انسان کے افعال پر نتائج مترتب کرتا ہے
۷۳ ایمان کو باغ سے مشابہت
۷۵۔ قرآن میں بے ایمانی کو زقوم سے مشابہت
۷۷۔ خدا کے ساتھ روحانی تعلق کا ذریعہ لقاء الٰہی کا مرتبہ
۷۹۔ دعا سے خدا کی جستجو کرو
" موت کے بعد انسان کی کیا حالت ہوتی ہے
۸۰۔ خواب اگلے جہان کے سمجھنے کا ذریعہ ہے۔
۸۱۔ بہشت کی نعمتوں کی فلاسفی
۸۳ موت کے بعد تین حالتیں
۸۵ یقین کے تین مراتب کا بیان
۸۶ لفظ برزخ کی لطیف تشریح
۸۷ روح کیلئے جسم ضروری ہے
" پیر فرتوت کی حالت
۸۹ مرنے کے بعد روح کو جسم ملتا ہے۔
" علوم معاد کا حصول پاک مکاشفات سے
۹۱ اعمال متمثل ہونگے
۹۲۔ دوزخ میں ستر گز زنجیر کی حقیقت
۹۳ بہشتیوں کے اعمال کا تمثل
۹۴ جنت کا صحیح فوٹو
" ترقیات غیر متناہی ہونگے
۹۵ بہشت میں مغفرت مانگنے کی حقیقت۔
۹۶ بہشت و دوزخ انسان کی زندگی کے اظلال ہیں
۹۶ تیسرا سوال۔ دنیا میں زندگی کے مدعا کیا ہیں اور ان کا حصول کس طرح ہوتا ہے
۹۵ انسان کی زندگی کا مدعا عبادت الٰہی ہے
" اسلام انسان کی فطرت میں ودیعت ہے۔
۹۸ خدا تک پہنچنے کے وسائل
" پہلا وسیلہ خدائے واحد پر ایمان ہے
۹۹ دوسرا وسیلہ خدا کے حسن و جمال پر ایمان ہے
" تیسرا وسیلہ خدا کے احسان جاننا ہے۔
۱۰۰۔ چوتھا وسیلہ دعا ہے
" پانچواں وسیلہ مجاہدہ ہے
" چھٹا وسیلہ استقامت ہے
۱۰۳ ساتواں وسیلہ راستبازوں کی صحبت ہے۔
" آٹھواں وسیلہ کشوف و الہام ہے۔
۱۰۴ چوتھا سوال۔ کہ زندگی میں اور زندگی کے بعد عملی شریعت کا فعل کیا ہے۔
۱۰۷ قرآنی قسموں کی فلاسفی
۱۱۲۔ پانچواں سوال کہ علم اور معرفت الٰہی کے ذرائع کیا کیا ہیں۔
۱۱۵۔ انسانی کانشنس بھی علم کا ذریعہ ہے۔
۱۱۷۔ الہام کے لئے استقامت شرط ہے۔
" الہام کی حقیقت
۱۱۸۔ اسلام کی بے نظیر خصوصیت
۱۲۳۔ اس زمانہ میں خاص مرتبہ مکالمہ مجھے ملا ہے۔ . . . .
. . . . ۱۲۴ تیسرا ذریعہ علم کا مصائب ہیں

آج اس جلسہ مبارک میں جس کی غرض یہ ہے۔ کہ ہر ایک صاحب جو بلائے گئے ہیں۔ سوالات مشتہرہ کی پابندی سے اپنے اپنے مذہب کی خوبیاں بیان فرماویں۔ میں اسلام کی خوبیاں بیان کروں گا +

اور پہلے اس سے کہ میں اپنے مطلب کو شروع کروں۔ اس قدر ظاہر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ مینے اس بات کا التزام کیا ہے۔ کہ جو کچھ بیان کروں۔ خدا تعالیٰ کے پاک کلام قرآن شریف سے بیان کروں۔ کیونکہ میرے نزدیک یہ بہت ضروری ہے کہ ہر ایک شخص جو کسی کتاب کا پابند ہو۔ اور اس کتاب کو ربانی کتاب سمجھتا ہو۔ وہ ہر ایک بات میں اسی کتاب کے حوالہ سے جواب دے۔ اور اپنی وکالت کے اختیارات

دعوی اور دلیل الہامی کتاب سے ہونا ضروری ہے

کو ایسا وسیع نہ کرے کہ گویا وہ ایک نئی کتاب بنا رہا ہے۔ سو چونکہ آج ہمیں
قرآن شریف کی خوبیوں کو ثابت کرنا ہے اور اس کے کمالات کو دکھلانا ہے۔
اس لئے مناسب ہے کہ ہم کسی بات میں اس کے اپنے بیان سے باہر نہ جائیں
اور اسی کے اشارہ یا تصریح کے موافق اور اسی کی آیات کے حوالہ سے ہر ایک
مقصد کو تحریر کریں تا ناظرین کو موازنہ اور مقابلہ کرنے کے لئے آسانی ہو۔ چونکہ
ہر ایک صاحب جو پابند کتاب ہیں۔ اپنی اپنی الہامی کتاب کے بیان کے پابند
رہیں گے۔ اور اسی کتاب کے اقوال پیش کریں گے۔ اس لئے ہم نے اس جگہ احادیث
کے بیان کو چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ تمام صحیح حدیثیں قرآن شریف سے ہی لی گئی ہیں۔
اور وہ کامل کتاب ہے جس پر تمام کتابوں کا خاتمہ ہے۔ غرض آج قرآن شریف
کی شان ظاہر ہونے کا دن ہے۔ اور ہم خدا سے دعا مانگتے ہیں۔ کہ وہ اس
کام میں ہمارا مددگار ہو۔ آمین ✝

سوال اوّل کا جواب

معزز ناظرین کو خیال رہے۔ کہ اس مضمون کے ابتدائی صفحوں میں بعض تمہیدی
عبارتیں ہیں۔ جو بظاہر غیر متعلق معلوم دیتی ہیں۔ مگر اصل جوابات کے سمجھنے کے لئے
پہلے ان کا سمجھنا نہایت ضروری ہے۔ اس لئے صفائی بیان کے لئے قبل از شروع
مطلب ان عبارتوں کو لکھا گیا۔ کہ تا اصل مطلب سمجھنے میں دقت نہ ہو ✝

حالاتِ ثلاثہ انسان

اب واضح ہو کہ پہلا سوال انسان کی طبعی اور اخلاقی اور روحانی حالتوں کے بارے
میں ہے سو جاننا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کے پاک کلام قرآن شریف نے ان تین
حالتوں کی اس طرح پر تقسیم کی ہے۔ کہ ان تینوں کے لئے علیحدہ علیحدہ تین مبدا ٹھہرائے ہیں
یا یوں کہو کہ تین سرچشمے قرار دیئے ہیں جن میں سے جدا جدا یہ حالتیں نکلتی ہیں ✝
چنانچہ پہلا سرچشمہ جو تمام طبعی حالتوں کا مورد اور مصدر ہے اس کا نام قرآن شریف نے

نفس امارہ رکھا ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ ۱۳ یعنی
نفس امارہ میں یہ خاصیت ہے۔ کہ وہ انسان کو بدی کی طرف جو اس کے کمال کے مخالف
اور اس کی اخلاقی حالتوں کے برعکس ہے جھکاتا ہے۔ اور ناپسندیدہ اور بد راہوں پر چلانا
چاہتا ہے۔ غرض بے اعتدالیوں اور بدیوں کی طرف جانا انسان کی ایک حالت ہے۔ جو
اخلاقی حالت سے پہلے اس پر طبعاً غالب ہوتی ہے اور یہ حالت اس وقت تک طبعی حالت
کہلاتی ہے۔ جبتک کہ انسان عقل اور معرفت کے زیر سایہ نہیں چلتا بلکہ چارپایوں کی طرح
کھانے پینے سونے جاگنے یا غصہ اور جوش دکھلانے وغیرہ امور میں طبعی جذبات کا پیرو
رہتا ہے۔ اور جب انسان عقل اور معرفت کے مشورہ سے طبعی حالتوں میں تصرف کرتا اور
اعتدال مطلوب کی رعایت رکھتا ہے۔ اسوقت ان تینوں حالتوں کا نام طبعی حالتیں نہیں رہتا
بلکہ اسوقت یہ حالتیں اخلاقی حالتیں کہلاتی ہیں جیسا کہ آگے بھی کچھ ذکر اس کا آئے گا +

دوم نفس لوّامہ

اور اخلاقی حالتوں کے سرچشمہ کا نام قرآن شریف میں نفس لوّامہ ہے جیسا کہ قرآن
شریف فرماتا ہے۔ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ یعنی میں اس نفس کی قسم
کھاتا ہوں۔ جو بدی کے کام اور ہر ایک بے اعتدالی پر اپنے تئیں ملامت کرتا ہے
یہ نفس لوامہ انسانی حالتوں کا دوسرا سرچشمہ ہے جس سے اخلاقی حالتیں پیدا ہوتی
ہیں۔ اور اس مرتبہ پر انسان دوسرے حیوانات کی مشابہت سے نجات پاتا ہے۔ اور اس جگہ نفس
لوامہ کی قسم کھانا اس کو عزت دینے کے لئے ہے۔ گویا وہ نفس امارہ سے نفس لوامہ بن کر بوجہ
اس ترقی کے جناب الٰہی میں عزت پانے کے لائق ہو گیا۔ اور اس کا نام لوامہ اس لئے
رکھا۔ کہ وہ انسان کو بدی پر ملامت کرتا ہے۔ اور اس بات پر راضی نہیں ہوتا کہ
انسان اپنے طبعی لوازم میں شتر بے مہار کی طرح چلے۔ اور چارپایوں کی طرح زندگی
بسر کرے۔ بلکہ یہ چاہتا ہے۔ کہ اس سے اچھی حالتیں اور اچھے اخلاق صادر ہوں اور
انسانی زندگی کے تمام لوازم میں کوئی بے اعتدالی ظہور میں نہ آوے۔ اور طبعی جذبات
اور طبعی خواہشیں عقل کے مشورہ سے ظہور پذیر ہوں۔ پس چونکہ وہ بری حرکت پر ملامت
کرتا ہے۔ اس لئے اس کا نام نفس لوامہ ہے۔ یعنی بہت ملامت کرنے والا۔ اور نفس لوامہ

اگرچہ طبعی جذبات پسند نہیں کرتا۔ بلکہ اپنے تئیں ملامت کرتا رہتا ہے لیکن نیکیوں کے بجا
لانے پر پورے طور سے قادر بھی نہیں ہو سکتا۔ اور کبھی نہ کبھی طبعی جذبات اسپر غلبہ کر
جاتے ہیں تب گر جاتا ہے۔ اور ٹھوکر کھاتا ہے۔ گویا وہ ایک کمزور بچہ کی طرح ہوتا ہے
جو گرنا نہیں چاہتا۔ مگر کمزوری کیوجہ سے گرتا ہے۔ پھر اپنی کمزوری پر نادم ہوتا ہے غرض
یہ نفس کی وہ اخلاقی حالت ہے۔ جب نفس اخلاق فاضلہ کو اپنے اندر جمع کرتا ہے۔ اور
سرکشی سے بیزار ہوتا ہے۔ مگر پورے طور پر غالب نہیں آسکتا +

نفس مطمئنہ

پھر ایک تیسرا چشمہ ہے جس کو روحانی حالتوں کا مبدء کہنا چاہیئے اس سرچشمہ کا
نام قرآن شریف نے نفس مطمئنہ رکھا ہے۔ جیساکہ وہ فرماتا ہے۔ یَا اَیَّتُھَا النَّفْسُ
الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً ۰ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ
وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۰ یعنی اے نفس آرام یافتہ جو خدا سے آرام پاگیا اپنے خدا کیطرف
واپس چلا آ۔ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی پس میرے بندوں میں مل جا اور میرے
بہشت کے اندر آجا۔ یہ وہ مرتبہ ہے جس میں نفس تمام کمزوریوں سے نجات پا کر روحانی قوتوں
سے بھر جاتا ہے اور خداوند تعالیٰ سے ایسا پیوند کر لیتا ہے کہ بغیر اس کے جی بھی نہیں سکتا
اور جس طرح پانی اوپر سے نیچے کیطرف بہتا اور بہ سبب اپنی کثرت کے اور نیز روکوں کے دور
ہونیسے بڑے زور سے چلتا ہے۔ اسی طرح وہ خدا کیطرف بہتا چلا جاتا ہے۔ اسی کیطرف
اشارہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ کہ اے وہ نفس جو خدا سے آرام پاگیا۔ اس کیطرف واپس
چلا آ۔ پس وہ اسی زندگی میں نہ موت کے بعد ایک عظیم الشان تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ اور اسی
دنیا میں نہ دوسری جگہ ایک بہشت اُس کو ملتا ہے اور جیساکہ اس آیت میں لکھا ہے
کہ تو اپنے رب کیطرف یعنی پرورش کرنیوالے کیطرف واپس آ۔ ایسا ہی اس وقت یہ خدا
سے پرورش پاتا ہے۔ اور خدا کی محبت اس کی غذا ہوتی ہے اور اسی زندگی بخش چشمہ
سے پانی پیتا ہے اس لئے موت سے نجات پاتا ہے۔ جیساکہ دوسری جگہ اللہ تعالےٰ
قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا ۰ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا
یعنے جس نے ارضی جذبات سے اپنے نفس کو پاک کیا۔ وہ بچ گیا۔ اور نہیں ہلاک ہوگا

مگر جس نے ارضی جذبات میں جو طبعی جذبات ہیں - اپنے تئیں چھپا دیا - وہ زندگی سے نا امید ہو گیا ÷

غرض یہ تین حالتیں ہیں - جنکو دوسرے لفظوں میں طبعی اور اخلاقی اور روحانی حالتیں کہہ سکتے ہیں - اور چونکہ طبعی تقاضے افراط کے وقت بہت خطرناک ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات اخلاق اور روحانیت کا ستیا ناس کر دیتے ہیں - اس لئے خدا تعالےٰ کی پاک کتاب میں انکو نفس امارہ کی حالتوں سے موسوم کیا گیا - اگر یہ سوال ہو - کہ انسان کی طبعی حالتوں پر قرآن شریف کا کیا اثر ہے اور وہ انکی نسبت کیا ہدایت دیتا ہے - اور عملی طور پر کس حد تک ان کو رکھنا چاہتا ہے تو واضح ہو - کہ قرآن شریعت کے رو سے انسان کی طبعی حالتوں کو اس کی اخلاقی اور روحانی حالتوں سے نہایت ہی شدید تعلقات واقع ہیں - یہانتک کہ انسان کے کھانے پینے کے طریقے بھی انسان کی اخلاقی اور روحانی حالتوں پر اثر کرتے ہیں - اور اگر ان طبعی حالتوں سے شریعت کی ہدایتوں کے موافق کام لیا جائے - تو جیسا کہ نمک کی کان میں پڑ کر ہر ایک چیز نمک ہی ہو جاتی ہے ایسا ہی یہ تمام حالتیں اخلاقی ہی ہو جاتی ہیں - اور روحانیت پر نہایت گہرا اثر کرتی ہیں - اسی واسطے قرآن شریف نے تمام عبادات اور اندرونی پاکیزگی کے اغراض اور خشوع خضوع کے مقاصد میں جسمانی طہارتوں اور جسمانی آداب اور جسمانی تعدیل کو بہت ملحوظ رکھا ہے اور غور کرنے کے وقت یہی فلاسفی نہایت صحیح معلوم ہوتی ہے کہ جسمانی اوضاع کا روح پر بہت قوی اثر ہے جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں - کہ ہمارے طبعی افعال گو بظاہر جسمانی ہیں مگر ہماری روحانی حالتوں پر ضرور ان کا اثر ہے - مثلاً جب ہماری آنکھیں رونا شروع کریں اور گو تکلف سے ہی روویں - مگر فی الفور ان آنسوؤں کا ایک شعلہ اٹھ کر دل پر جا پڑتا ہے - تب دل بھی آنکھوں کی پیروی کر کے غمگین ہو جاتا ہے ایسا ہی جب ہم تکلف سے ہنسنا شروع کریں - تو دل میں بھی ایک انبساط پیدا ہو جاتا ہے - یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ جسمانی سجدہ بھی روح میں خشوع اور عاجزی کی حالت پیدا کرتا ہے - اسکے مقابل پر ہم

انسان کی طبعی حالتوں پر قرآن شریف کا اثر

یہ بھی دیکھتے ہیں۔ کہ جب ہم گردن کو اونچی کھینچ کر اور چھاتی کو ابھار کر چلیں۔ تو یہ وضع رفتار ہم میں ایک قسم کا تکبر اور خود بینی پیدا کرتی ہے تو ان نمونوں سے پورے انکشاف کے ساتھ کھل جاتا ہے۔ کہ بیشک جسمانی اوضاع کا روحانی حالتوں پر اثر ہے +

ایسا ہی تجربہ ہم پر ظاہر کرتا ہے کہ طرح طرح کی غذاؤں کا بھی دماغی اور دلی قوتوں پر ضرور اثر ہے۔ مثلاً ذرا غور سے دیکھنا چاہیئے۔ کہ جو لوگ کبھی گوشت نہیں کھاتے۔ رفتہ رفتہ ان کی شجاعت کی قوت کم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ نہایت دل کے کمزور ہو جاتے ہیں اور ایک خداداد اور قابل تعریف قوت کو کھو بیٹھتے ہیں۔ اس کی شہادت خدا کے قانون قدرت سے اس طرح پر بھی ملتی ہے کہ چارپایوں میں سے جس قدر گھاس خور جانور ہیں۔ کوئی بھی ان میں سے وہ شجاعت نہیں رکھتا۔ جو ایک گوشت خوار جانور رکھتا ہے پرندوں میں بھی یہی بات مشاہدہ ہوتی ہے پس اس میں کیا شک ہے کہ اخلاق پر غذاؤں کا اثر ہے۔ ہاں جو لوگ دن رات گوشت خوری پر زور دیتے ہیں اور نباتی غذاؤں سے بہت ہی کم حصہ رکھتے ہیں۔ وہ بھی حلم اور انکسار کے خلق میں کم ہو جاتے ہیں اور میانہ روش کو اختیار کرنے والے دونوں خلق کے وارث ہوتے ہیں۔ اسی حکمت کے لحاظ سے خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ کُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا یعنی گوشت بھی کھاؤ اور دوسری چیزیں بھی کھاؤ۔ مگر کسی چیز کی حد سے زیادہ کثرت نہ کرو۔ تا اس کا اخلاقی حالت پر بد اثر نہ پڑے اور تا یہ کثرت مضر صحت بھی نہ ہو اور جیسا کہ جسمانی افعال اور اعمال کا روح پر اثر پڑتا ہے۔ ایسا ہی کبھی روح کا اثر بھی جسم پر جا پڑتا ہے۔ جس شخص کو کوئی غم پہنچے۔ آخر وہ چشم پر آب ہو جاتا ہے۔ اور جس کو خوشی ہو۔ آخر وہ تبسم کرتا ہے۔ جس قدر ہمارا کھانا پینا سونا جاگنا۔ حرکت کرنا۔ آرام کرنا۔ غسل کرنا وغیرہ افعال طبعیہ ہیں۔ یہ تمام افعال ضروری ہمارے روحانی حالات پر اثر کرتے ہیں۔ ہماری جسمانی بناوٹ کا ہماری انسانیت سے بڑا تعلق ہے۔ دماغ کے ایک مقام پر چوٹ لگنے سے یک لخت حافظہ جاتا رہتا ہے۔ اور دوسرے مقام پر چوٹ لگنے سے ہوش و حواس رخصت ہوتے ہیں۔ وبا

کی ایک زہریلی ہوا کس قدر جلدی سے جسم میں اثر کر کے پھر دل میں اثر کرتی ہے اور دیکھتے دیکھتے وہ اندرونی سلسلہ جس کے ساتھ تمام نظام اخلاق کا ہے۔ درہم برہم ہونے لگتا ہے یہانتک کہ انسان دیوانہ سا ہو کر چند منٹ میں گذر جاتا ہے۔ غرض جسمانی صدمات بھی عجیب نظارہ دکھاتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ رُوح اور جسم کا ایک ایسا تعلق ہے کہ اس راز کو کھولنا انسان کا کام نہیں۔ اس سے زیادہ اس تعلق کے ثبوت پر یہ دلیل ہے کہ غور سے معلوم ہوتا ہے کہ رُوح کی ماں جسم ہی ہے۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ میں روح کبھی اوپر سے نہیں گرتی۔ بلکہ وہ ایک نور ہے جو نطفہ میں پوشیدہ طور پر مخفی ہوتا ہے۔ اور جسم کے نشوونما کے ساتھ چمکتا جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کا پاک کلام ہمیں سمجھاتا ہے۔ کہ روح اس قالب میں سے ہی ظہور پذیر ہو جاتی ہے جو نطفہ سے رحم میں تیار ہوتا ہے جیسا کہ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ

یعنی پھر ہم اس جسم کو جو رحم میں تیار ہوا تھا۔ ایک اور پیدائش کے رنگ میں لاتے ہیں۔ اور ایک اور خلقت اس کی ظاہر کرتے ہیں۔ جو رُوح کے نام سے موسوم ہے اور خدا بہت برکتوں والا ہے۔ اور ایسا خالق ہے جو کوئی اُسکے برابر نہیں ہے اور یہ جو فرمایا کہ ہم اسی جسم میں سے ایک اور پیدائش ظاہر کرتے ہیں۔ یہ ایک گہرا راز ہے۔ جو روح کی حقیقت دکھلا رہا ہے اور ان نہایت مستحکم تعلقات کیطرف اشارہ کر رہا ہے۔ جو روح اور جسم کے درمیان واقع ہیں۔ اور یہ اشارہ ہمیں اس بات کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ کہ انسان کے جسمانی اعمال اور اقوال اور تمام طبعی افعال جب خدا تعالیٰ کے لئے اور اس کی راہ میں ظاہر ہونے شروع ہوں۔ تو اُن سے بھی یہی الٰہی فلاسفی متعلق ہے یعنی ان مخلصانہ اعمال میں بھی ابتدا ہی سے ایک رُوح مخفی ہوتی ہے۔ جیسا کہ نطفہ میں مخفی تھی۔ اور جیسے جیسے ان اعمال کا قالب تیار ہوتا جاتا ہے۔ وہ روح چمکتی جاتی ہے اور جب وہ قالب پورا تیار ہو چکتا ہے۔ تو یکدفعہ وہ رُوح اپنی کامل تجلّی کے ساتھ چمک اُٹھتی ہے۔ اور اپنی روحی حیثیت سے اپنے وجود کو دکھا دیتی ہے۔ اور زندگی کی صریح حرکت شروع ہو جاتی ہے۔ جبھی کہ اعمال کا پورا قالب تیار ہو جاتا ہے معاً بجلی کیطرح

ایک چیز اندر سے اپنی کھلی کھلی چمک دکھلانا شروع کر دیتی ہے یہ وہی زمانہ ہوتا ہے جسکی نسبت اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں مثالی طور سے فرماتا ہے۔ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ ۝ یعنی جب میں نے اس کا قالب بنا لیا۔ اور تجلیات کے تمام مظاہر درست کر لئے۔ اور اپنی رُوح اس میں پھونکدی تو تم سب لوگ اسکے لئے زمین پر سجدہ کرتے ہوئے گر جاؤ۔ سو اس آیت میں یہی اشارہ ہے۔ کہ جب اعمال کا پورا قالب تیار ہو جاتا ہے۔ تو اس قالب میں وہ رُوح چمک اُٹھتی ہے جس کو خدا تعالیٰ اپنی ذات کیطرف منسوب کرتا ہے۔ کیونکہ دُنیوی زندگی کے فنا کے بعد وہ قالب تیار ہوتا ہے۔ اس لئے الٰہی روشنی جو پہلے دھیمی تھی۔ یکدفعہ بھڑک اُٹھتی ہے۔ اور واجب ہوتا ہے کہ خدا کی ایسی شان کو دیکھ کر ہر ایک سجدہ کرے اور اس کی طرف کھینچا جائے۔ سو ہر ایک اس نور کو دیکھ کر سجدہ کرتا ہے اور طبعاً اس طرف آتا ہے۔ بجز ابلیس کے جو تاریکی سے دوستی رکھتا ہے ؞

روح کی پیدائش

پھر میں پہلی بات کی طرف رجوع کر کے بیان کرتا ہوں۔ کہ یہ بات نہایت درست اور صحیح ہے۔ کہ رُوح ایک لطیف نور ہے جو اس جسم کے اندر ہی سے پیدا ہو جاتا ہے جو رحم میں پرورش پاتا ہے۔ پیدا ہونیسے مراد یہ ہے کہ اول مخفی اور غیر محسوس ہوتا ہے۔ پھر نمایاں ہو جاتا ہے۔ اور ابتدا اس کا خمیر نطفہ میں موجود ہوتا ہے بیشک وہ آسمانی خدا کے ارادہ سے اور اس کے اذن اور اسکی مشیت سے ایک مجہول الکنہ علاقہ کے ساتھ نطفہ سے تعلق رکھتا ہے۔ اور نطفہ کا وہ ایک روشن اور نورانی جوہر ہے نہیں کہہ سکتے کہ وہ نطفہ کی ایسی جزو ہے جیسا کہ جسم جسم کی جزو ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی نہیں کہہ سکتے۔ کہ وہ باہر سے آتا ہے۔ یا زمین پر گر کر نطفہ کے مادہ سے آمیزش پاتا ہے۔ بلکہ وہ ایسا نطفہ میں مخفی ہوتا ہے۔ جیسا کہ آگ پتھر کے اندر ہوتی ہے۔ خدا کی کتاب کا یہ منشاء نہیں ہے کہ رُوح الگ طور پر آسمان سے نازل ہوتی ہے۔ یا فضا سے زمین پر گرتی ہے اور پھر کسی اتفاق سے نطفہ کے ساتھ مل کر رحم کے اندر چلی جاتی ہے۔ بلکہ یہ خیال کسی طرح صحیح نہیں ٹھہر سکتا۔ اگر ہم ایسا خیال کریں۔ تو قانون قدرت ہمیں باطل پر ٹھہراتا ہے۔ ہم روز

مشاہدہ کرتے ہیں کہ گندے اور باسی کھانوں میں اور گندے زخموں میں ہزارہا کیڑے پڑ جاتے ہیں میلے کپڑوں میں صدہا جوئیں پڑ جاتی ہیں۔ انسان کے پیٹ کے اندر بھی کدو دانے وغیرہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ اب کیا ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ وہ باہر سے آتے ہیں۔ یا آسمان سے اُترتے کسی کو دکھائی دیتے ہیں۔ سو صحیح بات یہ ہے۔ کہ رُوح جسم میں سے ہی نکلتی ہے اور اسی دلیل سے اُس کا مخلوق ہونا بھی ثابت ہوتا ہے ؎

اب اس وقت ہمارا مطلب اس بیان سے یہ ہے کہ جس قادر مطلق نے روح کو قدرت کاملہ کے ساتھ جسم میں سے ہی نکالا ہے۔ اس کا یہی ارادہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ روح کی دوسری پیدائش کو بھی جسم کے ذریعہ سے ہی ظہور میں لاوے۔ رُوح کی حرکتیں ہمارے جسم کی حرکتوں پر موقوف ہیں جس طرف ہم جسم کو کھینچتے ہیں۔ روح بھی بالضرور پیچھے پیچھے چلی آتی ہے۔

روح کی دوسری پیدائش

اس لئے انسان کی طبعی حالتوں کیطرف متوجہ ہونا خدا تعالیٰ کی سچی کتاب کا کام ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ قرآن شریف نے انسان کی طبعی حالتوں کی اصلاح کے لئے بہت توجہ فرمائی ہے۔ اور انسان کا ہنسنا۔ رونا۔ کھانا۔ پینا۔ پہننا۔ سونا۔ بولنا۔ چپ ہونا۔ بیوی کرنا۔ مجرد رہنا۔ چلنا اور ٹھہرنا۔ اور ظاہری پاکیزگی غسل وغیرہ کی شرائط بجالانا اور بیماری کی حالت اور صحت کی حالت میں خاص خاص طریقوں کا پابند ہونا ان سب باتوں پر ہدایتیں لکھی ہیں۔ اور انسان کی جسمانی حالتوں کو روحانی حالتوں پر بہت ہی مؤثر قرار دیا ہے۔ اگر ان ہدایتوں کو تفصیل سے لکھا جائے۔ تو میں خیال نہیں کر سکتا کہ اس مضمون کے سنانے کے لئے کوئی وقت کافی مل سکے ؎

پس جب خدا کے پاک کلام پر غور کرتا ہوں۔ اور دیکھتا ہوں۔ کہ کیونکر اس نے اپنی تعلیموں میں انسان کو اسکی طبعی حالتوں کی اصلاح کے قواعد عطا فرما کر پھر آہستہ آہستہ اوپر کی طرف کھینچا ہے۔ اور اعلیٰ درجہ کی روحانی حالت تک پہنچانا چاہا ہے۔ تو مجھے یہ پُر معرفت قاعدہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اوّل خدا نے یہ چاہا ہے کہ انسان کو نشست برخاست اور کھانے پینے اور بات چیت اور تمام اقسام معاشرت کے طریق سکھلا کر اس کو وحشیانہ طریقوں سے نجات دیوے۔ اور حیوانات

کی منشا بہت سی تمیز کلی بخش کر ایک ادنیٰ درجہ کی اخلاقی حالت جس کو ادب اور شائستگی
کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ سکھلاوے۔ پھر انسان کی نیچرل عادات کو جن کو دوسرے
لفظوں میں اخلاق ذمیلہ کہہ سکتے ہیں۔ اعتدال پر لاوے۔ تا وہ اعتدال پا کر اخلاق
فاضلہ کے رنگ میں آجائیں۔ مگر یہ دونوں طریقے دراصل ایک ہی ہیں۔ کیونکہ طبعی
حالتوں کی اصلاح کے متعلق ہیں صرف اعلیٰ اور ادنیٰ درجہ کے فرق نے انکو دو قسم
بنا دیا ہے اور اس حکیم مطلق نے اخلاق کے نظام کو ایسے طور سے پیش کیا ہے۔
کہ جس سے انسان ادنٰے خُلق سے اعلیٰ خُلق تک ترقی کر سکے ٭

اور پھر تیسرا مرحلہ ترقیات کا یہ رکھا ہے کہ انسان اپنے خالق حقیقی کی محبت اور
رضا میں محو ہو جائے۔ اور سب وجود اس کا خدا کیلئے ہو جائے۔ یہ وہ مرتبہ ہے جسکو
یاد دلانے کیلئے مسلمانوں کے دین کا نام اسلام رکھا گیا ہے۔ کیونکہ اسلام اس بات
کو کہتے ہیں۔ کہ بکلّی خدا کے لئے ہو جانا۔ اور اپنا کچھ باقی نہ رکھنا۔ جیسا کہ اللہ جلّ جلالہٗ
فرماتا ہے بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ
وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ قُلْ اِنَّ صَلٰوتِيْ وَنُسُكِيْ وَ
مَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ
وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا ۝ فَاتَّبِعُوْهُ
وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ
اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ ۝ پ ۳ ترجمہ یعنی نجات یافتہ وہ شخص ہے۔ جو اپنے وجود کو خدا کے لئے اور خدا
کی راہ میں قربانی کیطرح رکھ دے۔ اور نہ صرف نیت سے بلکہ نیک کاموں سے اپنے صدق کو
دکھلا دے جو شخص ایسا کرے۔ اس کا بدلہ خدا کے نزدیک مقرر ہو چکا۔ اور ایسے لوگوں پر
نہ کچھ خوف ہے۔ اور نہ کچھ غمگین ہونگے۔ کہہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا زندہ رہنا
اور میرا مرنا اس خدا کے لئے ہے جسکی ربوبیت تمام چیزوں پر محیط ہے۔ کوئی چیز اور کوئی
شخص اس کا شریک نہیں اور مخلوق کو کسی قسم کی شراکت اس کے ساتھ نہیں۔ مجھے یہی حکم

ہے۔ کہ میں ایسا کروں۔ اور اسلام کے مفہوم پر قائم ہونے والا یعنی خدا کی راہ میں اپنے
وجود کی قربانی دینے والا سب سے اوّل میں ہوں۔ یہ میری راہ ہے۔ سو آؤ میری راہ
اختیار کرو۔ اور اس کے مخالف کوئی راہ اختیار نہ کرو۔ کہ خدا سے دُور جا پڑو گے۔ انکو
کہدے۔ کہ اگر خدا سے پیار کرتے ہو۔ تو آؤ میرے پیچھے ہولو۔ اور میری راہ پر چلو۔ تا خدا
بھی تم سے پیار کرے۔ اور تمہارے گناہ بخشے۔ اور وہ تو بخشندہ اور رحیم ہے ؛

اب ہم انسان کے ان تین مرحلوں کا جُدا جُدا بیان کرینگے۔ لیکن اوّل یہ یاد
دلانا ضروری ہے۔ کہ طبعی حالتیں جن کا سرچشمہ اور منبع نفس امّارہ ہے خدا تعالیٰ
کے پاک کلام کے اشارات کے موافق اخلاقی حالتوں سے کوئی الگ چیز نہیں ہے
کیونکہ خدا کے پاک کلام نے تمام نیچرل قوتی اور جسمانی خواہشوں اور تقاضوں کو
طبعی حالات کی مد میں رکھا ہے۔ اور وہی طبعی حالتیں ہیں جو بالارادہ ترتیب اور
تعدیل اور موقع بینی اور محل پر استعمال کرنیکے بعد اخلاق کا رنگ پکڑ لیتی ہیں
ایسا ہی اخلاقی حالتیں روحانی حالتوں سے کوئی الگ باتیں نہیں ہیں۔ بلکہ وہی
اخلاقی حالتیں ہیں۔ جو پورے فنا فی اللہ اور تزکیہ نفس اور پورے انقطاع الی اللہ
اور پوری محبت اور پوری محویت اور پوری سکینت اور اطمینان اور پوری موافقت
باللہ سے روحانیت کا رنگ پکڑ لیتی ہیں۔ طبعی حالتیں جب تک اخلاقی رنگ
میں نہ آئیں کسی طرح انسان کو قابل تعریف نہیں بناتیں۔ کیونکہ وہ دوسرے
حیوانات بلکہ جمادات میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ایسا ہی مجرد اخلاق کا حاصل کرنا
بھی انسان کو روحانی زندگی نہیں بخشتا۔ بلکہ ایک شخص خدا تعالیٰ کے وجود سے
بھی منکر رہکر اچھے اخلاق دکھلا سکتا ہے۔ دل کا غریب ہونا یا دل کا حلیم ہونا یا
صلح کار ہونا یا ترک شر کرنا اور شریر کے مقابلہ پر نہ آنا یہ تمام طبعی حالتیں ہیں
اور ایسی باتیں ہیں۔ جو ایک نا اہل کو بھی حاصل ہو سکتی ہیں۔ جو اصل سرچشمہ نجات سے
بے نصیب اور ناآشنا محض ہے۔ اور بہت سے چارپائے غریب بھی ہوتے ہیں۔ اور ہلتی
اور تو پذیر ہونے سے صلح کاری بھی دکھلاتے ہیں۔ سوٹے پر سوٹا مارنے سے کوئی

طبعی و اخلاق میں فرق

مقابلہ نہیں کرتے۔ مگر پھر بھی انکو انسان نہیں کہہ سکتے۔ چہ جائیکہ ان خصلتوں سے وہ اعلیٰ درجہ کے انسان بن سکیں۔ ایسا ہی بد سے بد عقیدہ والا بلکہ بعض بدکاریوں کا مرتکب ان باتوں کا پابند ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے۔ کہ انسان رحم میں اس حد تک پہنچ جائے کہ اگر اسکے اپنے ہی زخم میں کیڑے پڑیں۔ انکو بھی قتل کرنا روا نہ رکھے۔ اور جاندار وں کی پاسداری اس قدر کرے کہ جوئیں جو سر میں پڑتی ہیں یا وہ کیڑے جو پیٹ اور انتڑیوں میں اور دماغ میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو بھی آزار دینا نہ چاہے۔ بلکہ میں قبول کر سکتا ہوں کہ کسی کا رحم اس حد تک پہنچے۔ کہ وہ شہد کھانا ترک کر دے۔ کیونکہ وہ بہت سی جانوں کے تلف ہونے اور غریب مکھیوں کو ان کے استھان سے بر اگندہ کرنیکے بعد حاصل ہوتا ہے اور میں مانتا ہوں۔ کہ کوئی مشک سے بھی پرہیز کرے۔ کیونکہ وہ غریب ہرن کا خون ہے۔ اور اس غریب کو قتل کرنے اور بچوں سے جدا کرنے کے بعد میسر آسکتا ہے۔ ایسا ہی مجھے اس سے بھی انکار نہیں۔ کہ کوئی موتیوں کے استعمال کو بھی چھوڑ دے اور ابریشم کو پہننا بھی ترک کرے۔ کیونکہ یہ دونوں غریب کیڑوں کے ہلاک کرنیسے ملتے ہیں۔ بلکہ میں یہانتک مانتا ہوں۔ کہ کوئی شخص دکھ کے وقت جوکوں کے لگانے سے بھی پرہیز کرے۔ اور آپ دکھ اٹھائے اور غریب جوک کی موت کا خواہاں نہ ہو۔ بالآخر اگر کوئی مانے یا نہ مانے۔ مگر میں مانتا ہوں۔ کہ کوئی شخص اس قدر رحم کو کمال کے نقطہ تک پہنچا دے۔ کہ پانی پینا چھوڑ دے۔ اور اس طرح پانی کے کیڑوں کے بچانیکے لئے اپنے تئیں ہلاک کرے۔ میں یہ سب کچھ قبول کرتا ہوں۔ لیکن میں ہرگز قبول نہیں کر سکتا کہ یہ تمام طبعی حالتیں اخلاق کہلا سکتی ہیں۔ یا صرف انہیں سے وہ اندرونی گند دھوئے جا سکتے ہیں۔ جن کا وجود خدا کے ملنے کی روک ہے۔ میں کبھی باور نہیں کروں گا۔ کہ اس طرح کا غریب اور بے آزار بننا جس میں بعض چارپایوں اور پرندوں کا کچھ نمبر زیادہ ہے۔ اعلیٰ انسانیت کے حصول کا موجب ہو سکتا ہے۔ بلکہ میرے نزدیک یہ قانونِ قدرت سے لڑائی ہے اور رضا کے بھاری خلق کے برخلاف۔ اور اس نعمت کو رد کرنا ہے۔ جو قدرت نے ہم کو عطا کی ہے بلکہ وہ روحانیت ہر ایک خلق کو محل اور موقع پر استعمال

کرنیکے بعد اور پھر خدا کی راہوں میں وفاداری کے ساتھ قدم مارنے سے اور اسی کا ہو جانیسے ملتی ہے۔ جو اس کا ہو جاتا ہے۔ اسکی یہی نشانی ہے کہ وہ اسکے بغیر جی ہی نہیں سکتا۔ عارف ایک مچھلی ہے۔ جو خدا کے ہاتھ سے ذبح کی گئی اور اس کا پانی خدا کی محبت ہے ؛

تین طرح کی اصلاح

اب میں پہلے کلام کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ میں ابھی ذکر کر چکا ہوں۔ کہ انسانی حالتوں کے سرچشمے تین ہیں۔ یعنی نفس امّارہ۔ نفس لوّامہ۔ نفس مطمئنہ۔ اور طریق اصلاح کے بھی تین ہیں۔ اوّل یہ کہ بے تمیز وحشیوں کو اس ادنیٰ خُلق پر قائم کیا جائے۔ کہ وہ کھانے پینے اور شادی وغیرہ تمدنی امور میں انسانیت کے طریقے پر چلیں۔ نہ ننگے پھریں نہ کتّوں کی طرح مُردار خوار ہوں اور نہ کوئی اور بے تمیزی ظاہر کریں یہ طبعی حالتوں کی اصلاحوں میں سے ادنیٰ درجہ کی اصلاح ہے۔ یہ اس قسم کی اصلاح ہے۔ کہ اگر مثلاً پورٹ بلیر کے جنگلی آدمیوں میں سے کسی آدمی کو انسانیت کے لوازم سکھلانا ہو۔ تو پہلے ادنیٰ ادنیٰ اخلاق انسانیت سے اور طریق ادب سے انکو تعلیم دی جائیگی۔ دوسرا طریق اصلاح کا یہ ہے کہ جب کوئی ظاہری آداب انسانیت کے حاصل کر لیوے۔ تو اس کو بڑے بڑے اخلاق انسانیت کے سکھلائے جائیں۔ اور انسانی قوی میں جو کچھ بھرا پڑا ہے۔ ان سب کو محل اور موقع پر استعمال کرنے کی تعلیم دیجائے تیسرا طریق اصلاح کا یہ ہے۔ کہ جو لوگ اخلاق فاضلہ سے متصف ہو گئے ہیں۔ ایسے خشک شاہدوں کو شربتِ محبّت اور وصل کا مزا چکھایا جائے۔ یہ تین اصلاحیں ہیں جو قرآن شریف نے بیان فرمائی ہیں ؛

قرآن شریف کی اصلی غرض ۔ بعثت آنحضرت صلعم

اور ہمارے سید و مولیٰ نبی صلے اللہ علیہ وسلم ایسے وقت میں مبعوث ہوئے تھے۔ جبکہ دنیا ہر ایک پہلو سے خراب اور تباہ ہو چکی تھی۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ پ۲۱۔ یعنی جنگل بھی بگڑ گئے یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے۔ کہ جو اہل کتاب کہلاتے ہیں وہ بھی بگڑ گئے اور جو دوسرے لوگ ہیں۔ جن کو الہام کا پانی نہیں ملا۔ وہ بھی بگڑ گئے ہیں پس قرآن شریف کا کام دراصل مُردوں کو زندہ کرنا تھا۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا ؕ ۲۷/۱۸ یعنی یہ بات جان لو۔ کہ اب اللہ تعالیٰ
نئے سرے سے زمین کو بعد اُس کے مرنے کے زندہ کرنے لگا ہے۔ اس زمانہ میں عرب کا
حال نہایت درجہ وحشیانہ حالت تک پہنچا ہوا تھا۔ اور کوئی نظام انسانیت کا ان
میں باقی نہیں رہا تھا۔ اور تمام معاصی ان کی نظر میں فخر کی جگہ تھے۔ ایک ایک شخص صدہا
بیویاں کر لیتا تھا۔ حرام کا کھانا ان کے نزدیک ایک شکار تھا۔ ماؤں کے ساتھ
نکاح کرنا حلال سمجھتے تھے۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ کو کہنا پڑا۔ کہ حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ
اُمَّھٰتُکُمْ ؕ ۴/۵ یعنی آج مائیں تمہاری تم پر حرام ہو گئیں۔ ایسا ہی وہ مردار کھاتے
تھے۔ آدم خور بھی تھے۔ دنیا کا کوئی بھی گناہ نہیں۔ جو نہیں کرتے تھے۔ اکثر معاد سے
منکر تھے۔ بہت سے ان میں سے خدا کے وجود کے بھی قائل نہ تھے۔ لڑکیوں کو اپنے
ہاتھ سے قتل کرتے تھے۔ یتیموں کو ہلاک کر کے اُن کا مال کھاتے تھے۔ بظاہر تو انسان
تھے۔ مگر عقلیں مسلوب تھیں۔ نہ حیا تھی نہ شرم تھی۔ نہ غیرت تھی۔ شراب کو پانی کی طرح
پیتے تھے۔ جس کا زناکاری میں اول نمبر ہوتا تھا۔ وہی قوم کا رئیس کہلاتا تھا۔ بے علمی
اس قدر تھی۔ کہ ارد گرد کی تمام قوموں نے ان کا نام اُمّی رکھ دیا تھا۔ ایسے وقت میں اور
ایسی قوموں کی اصلاح کے لئے ہمارے سید و مولیٰ نبی صلے اللہ علیہ وسلم شہر مکہ میں ظہور فرما
ہوئے۔ پس وہ تین قسم کی اصلاحیں جن کا ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں۔ ان کا درحقیقت یہی
زمانہ تھا۔ پس اسی وجہ سے قرآن شریف دنیا کی تمام ہدایتوں کی نسبت اکمل و اتم ہونے
کا دعویٰ کرتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی اور کتابوں کو ان تین قسم کی اصلاحوں کا موقعہ نہیں ملا
اور قرآن شریف کو ملا۔ اور قرآن شریف کا یہ مقصد تھا۔ کہ حیوانوں سے انسان بناوے
اور انسان سے با اخلاق انسان بناوے اور با اخلاق انسان سے با خدا انسان بناوے

اسی واسطے ان تینوں امور پر قرآن شریف مشتمل ہے ✤

اور قبل اس کے جو ہم اصلاحات ثلثہ کا مفصل بیان کریں۔ یہ ذکر کرنا بھی
ضروری سمجھتے ہیں۔ کہ قرآن شریف میں کوئی ایسی تعلیم نہیں۔ جو زبردستی ماننی پڑے بلکہ
تمام قرآن کا مقصد صرف اصلاحات ثلثہ ہیں۔ اور اس کی تمام تعلیموں کا لُبِّ لباب

قرآن شریف کا مقصد اصلاحات ثلثہ ہیں

یہی تین اصلاحیں ہیں۔ اور باقی تمام احکام اصلاحوں کے لئے بطور وسائل کے ہیں۔ اور جس طرح بعض وقت ڈاکٹر کو بھی صحت کے پیدا کرنے کے لئے کبھی چیرنے کبھی مرہم لگانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ ایسا ہی قرآنی تعلیم نے بھی انسانی ہمدردی کے لئے ان لوازم کو اپنے اپنے محل پر استعمال کیا ہے۔ اور اس کے تمام معارف یعنی گیان کی باتیں اور وصایا اور وسائل کا اصل مطلب یہ ہے کہ انسانوں کو انکی طبعی حالتوں سے جو وحشیانہ رنگ اپنے اندر رکھتی ہیں۔ اخلاقی حالتوں تک پہنچائے۔ اور پھر اخلاقی حالتوں سے روحانیت کے ناپیدا کنار دریا تک پہنچائے ؛

[illegible]

اور پہلے ہم بیان کر چکے ہیں۔ کہ طبعی حالات اخلاقی حالات سے کچھ الگ چیز نہیں بلکہ وہی حالات ہیں۔ جو تعدیل اور موقع اور محل پر استعمال کرنے سے اور عقل کی تجویز اور مشورہ سے کام میں لانے سے اخلاقی حالات کا رنگ پکڑ لیتے ہیں۔ اور قبل اس کے کہ وہ عقل اور معرفت کی اصلاح اور مشورہ سے صادر ہوں۔ گو وہ کیسے ہی اخلاق سے مشابہ ہوں۔ درحقیقت اخلاق نہیں ہوتے۔ بلکہ طبیعت کی ایک بے اختیار رفتار ہوتی ہے جیسا کہ اگر ایک کتے یا ایک بکری سے اپنے مالک کے ساتھ محبت اور انکسار ظاہر ہو۔ تو اس کتے کو خلیق نہیں کہینگے اور نہ اس بکری کا نام مہذب الاخلاق رکھیں گے۔ اسی طرح ہم ایک بھیڑیئے یا شیر کو ان کی درندگی کی وجہ سے بدخلق نہیں کہیں گے۔ بلکہ جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے۔ اخلاقی حالت محل اور سوچ اور وقت شناسی کے بعد شروع ہوتی ہے اور ایک ایسا انسان جو عقل اور تدبیر سے کام نہیں لیتا۔ وہ ان شیرخوار بچوں کی طرح ہے۔ جن کے دل اور دماغ پر ہنوز قوت عقلیہ کا سایہ نہیں پڑا۔ یا اُن دیوانوں کی طرح جو جوہر عقل و دانش کو کھو بیٹھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص بچہ شیرخوار اور دیوانہ ہو۔ وہ ایسی حرکات بعض اوقات ظاہر کرتا ہے کہ جو اخلاق کے ساتھ مشابہ ہوتی ہیں۔ مگر کوئی عقلمند ان کا نام اخلاق نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ وہ حرکات تمیز اور موقعہ بینی کے چشمے سے نہیں نکلتیں۔ بلکہ وہ طبعی طور پر تحریکوں کے پیش آنیکے وقت صادر

ہوتی جاتی ہیں۔ جیسا کہ انسان کا بچہ پیدا ہوتے ہی ماں کی چھاتیوں کیطرف رُخ کرتا ہے۔ اور ایک مرغ کا بچہ پیدا ہوتے ہی دانہ چُگنے کے لئے دوڑتا ہے۔ جوک کا بچہ جوک کی عادتیں اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور سانپ کا بچہ سانپ کی عادتیں ظاہر کرتا ہے۔ اور شیر کا بچہ شیر کی عادتیں دکھلاتا ہے۔ بالخصوص انسان کے بچہ کو غور سے دیکھنا چاہیئے کہ وہ کیسے پیدا ہوتے ہی انسانی عادتیں دکھلانا شروع کر دیتا ہے اور پھر جب برس ڈیڑھ برس کا ہوا تو وہ عاداتِ طبیعہ بہت نمایاں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً پہلے جس طور سے روتا تھا۔ اب رونا بہ نسبت پہلے کے کسی قدر بلند ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی ہنسنا قہقہہ کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ اور آنکھوں میں بھی عمداً دیکھنے کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور اس عمر میں یہ ایک اور امر طبعی پیدا ہو جاتا ہے کہ اپنی رضامندی یا نارضامندی حرکات سے ظاہر کرتا ہے اور کسی کو مارتا اور کسی کو کچھ دینا چاہتا ہے۔ مگر یہ تمام حرکات دراصل طبعی ہوتی ہیں۔ پس ایسے بچہ کی مانند ایک وحشی آدمی بھی جس کو انسانی تمیز سے بہت ہی کم حصہ ملا ہے۔ وہ بھی اپنے ہر ایک قول اور فعل اور حرکت اور سکون میں طبعی حرکات ہی دکھلاتا ہے اور اپنی طبیعت کے جذبات کا تابع رہتا ہے۔ کوئی بات اس کے اندرونی قویٰ کے تدبّر اور تفکر سے نہیں نکلتی بلکہ جو کچھ طبعی طور پر اس کے اندر پیدا ہوا ہے۔ وہ خارجی تحریکوں کے مناسب حال نکلتا چلا جاتا ہے۔ یہ ممکن ہے۔ کہ اس کے طبعی جذبات جو اس کے اندر سے کسی تحریک سے باہر آتے ہیں۔ وہ سب کے سب بُرے نہ ہوں بلکہ بعض ان کے نیک اخلاق سے مشابہ ہوں۔ لیکن عاقلانہ تدبّر اور موشگافی کو ان میں دخل نہیں ہوتا۔ اور اگر کسی قدر ہو بھی۔ تو وہ بوجہ غلبہ جذبات طبعی کے قابلِ اعتبار نہیں ہوتا۔ بلکہ جس طرف کثرت ہے۔ اسی طرف کو معتبر سمجھا جائے گا۔

حقیقی خلق

غرض ایسے شخص کی طرف حقیقی اخلاق منسوب نہیں کر سکتے جس پر جذبات طبعیہ حیوانوں اور بچوں اور دیوانوں کی طرح غالب ہیں۔ اور جو اپنی زندگی کو قریب قریب وحشیوں کے بسر کرتا ہے۔ بلکہ حقیقی طور پر نیک یا بداخلاق

کا زمانہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے۔ جب انسان کی عقل خداداد پختہ ہو کر اس کے ذریعہ سے نیکی اور بدی یا دو بدیوں یا دو نیکیوں کے درجہ میں فرق کر سکے۔ پھر اچھی راہ کے ترک کرنے سے اپنے دل میں ایک حسرت پاوے اور بُرے کام کے ارتکاب سے اپنے تئیں نادم اور پشیمان دیکھے۔ یہ انسان کی زندگی کا دوسرا زمانہ ہے جس کو خدا نے پاک کلام قرآن شریف میں نفس لوامہ کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ مگر یاد رہے۔ کہ ایک وحشی کو نفس لوامہ کی حالت تک پہنچانے کے لئے صرف سرسری نصائح کافی نہیں ہو سکتیں بلکہ ضروری ہوتا ہے۔ کہ اس کو خداشناسی کا اس قدر حصہ ملے جس سے وہ اپنی پیدائش بیہودہ اور لغو خیال نہ کرے۔ تا معرفت الٰہی سے سچے اخلاق اس میں پیدا ہوں۔ اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے ساتھ سچے خدا کی معرفت کے لئے توجہ دلائی ہے اور یقین دلایا ہے۔ کہ ہر ایک عمل اور خلق ایک نتیجہ رکھتا ہے۔ جو اس کی زندگی میں روحانی راحت یا روحانی عذاب کا موجب ہوتا ہے۔ اور دوسری زندگی میں کھلے کھلے طور پر اپنا اثر دکھائیگا۔ غرض نفس لوامہ کے درجہ پر انسان کو عقل اور معرفت اور پاک کانشنس سے اس قدر حصہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ بُرے کام پر اپنے تئیں ملامت کرتا ہے اور نیک کام کا خواہشمند اور حریص رہتا ہے۔ یہ وہی درجہ ہے۔ کہ جس میں انسان اخلاق فاضلہ حاصل کرتا ہے ؎

خَلق اور خُلق میں فرق

اس جگہ بہتر ہوگا۔ کہ میں خلق کے لفظ کی کسی قدر تعریف کر دوں۔ سو جاننا چاہیئے۔ کہ خَلق خا کی فتح سے ظاہری پیدائش کا نام ہے۔ اور خُلق خا کی ضمہ سے باطنی پیدائش کا نام ہے۔ اور چونکہ باطنی پیدائش اخلاق سے ہی کمال کو پہنچتی ہے۔ نہ صرف طبعی جذبات سے۔ اس لئے اخلاق پر ہی یہ لفظ بولا گیا ہے۔ طبعی جذبات پر نہیں بولا گیا۔ اور پھر یہ بات بھی بیان کر دینے کے لائق ہے کہ جیسا کہ عوام الناس خیال کرتے ہیں۔ کہ خُلق صرف حلیمی اور نرمی اور انکساری کا نام ہے۔ یہ انکی غلطی ہے۔ بلکہ جو کچھ بمقابلہ ظاہری اعضا کے باطن میں انسانی کمالات کی کیفیتیں رکھی گئی ہیں۔ ان سب کیفیتوں کا نام خُلق ہے۔ مثلاً انسان آنکھ

سے روتا ہے۔ اور اس کے مقابل پر دل میں ایک قوّتِ رقّت ہے۔ وہ جب بذریعہ عقلِ خداداد کے اپنے محل پر مستعمل ہو۔ تو وہ ایک خُلق ہے۔ ایسا ہی انسان ہاتھوں سے دشمن کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور اس حرکت کے مقابل پر دل میں ایک قوّت ہے جس کو شجاعت کہتے ہیں۔ پس جب انسان محل اور موقع کے لحاظ سے اس قوت کو استعمال میں لاتا ہے۔ تو اس کا نام بھی خُلق ہے اور ایسا ہی انسان کبھی ہاتھوں کے ذریعہ سے مظلوموں کو ظالموں سے بچانا چاہتا ہے یا ناداروں اور بھوکوں کو کچھ دینا چاہتا ہے۔ یا کسی اور طرح بنی نوع کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ اور اس حرکت کے مقابل پر دل میں ایک قوت ہے جسکو رحم بولتے ہیں۔ اور کبھی انسان اپنے ہاتھوں کے ذریعہ سے ظالم کو سزا دیتا ہے۔ اور اس حرکت کے مقابل پر دل میں ایک قوت ہے۔ جس کو انتقام کہتے ہیں۔ اور کبھی انسان حملہ کے مقابل پر حملہ کرنا نہیں چاہتا اور ظالم کے ظلم سے درگذر کرتا ہے۔ اور اس حرکت کے مقابل پر دل میں ایک قوت ہی جسکو عفو اور صبر کہتے ہیں۔ اور کبھی انسان بنی نوع کو فائدہ پہنچانے کے لئے اپنے ہاتھوں سے کام لیتا ہے۔ یا پیر دل سے یا دل اور دماغ سے۔ اور انکی بہبودی کیلئے اپنا سرمایہ خرچ کرتا ہے تو اس حرکت کے مقابل پر دل میں ایک قوت ہے جسکو سخاوت کہتے ہیں پس جب انسان ان تمام قوتوں کو موقع اور محل کے لحاظ سے استعمال کرتا ہے تو اس وقت اُن کا نام خُلق رکھا جاتا ہے۔ اللہ جلشانہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ ۲۹ پ یعنی تو ایک بزرگ خلق پر قائم ہے۔ سو اسی تشریح کے مطابق اس کے معنی ہیں۔ یعنی یہ کہ تمام قسمیں اخلاق کی سخاوت شجاعت۔ عدل۔ رحم۔ احسان۔ صدق۔ حوصلہ وغیرہ تجھ میں جمع ہیں۔ غرض جس قدر انسان کے دل میں قوتیں پائی جاتی ہیں۔ جیسا کہ ادب۔ حیا۔ دیانت۔ مروت۔ غیرت استقامت عفت۔ ذہانت۔ اعتدال۔ مواسات یعنے ہمدردی ایسا ہی شجاعت سخاوت۔ عفو صبر احسان۔ صدق۔ وفا وغیرہ۔ جب یہ تمام طبعی حالتیں عقل اور تدبر کے مشورہ سے اپنے اپنے محل اور موقع پر ظاہر کی جائیں گی۔ تو سب کا نام اخلاق

ہوگا۔ اور یہ تمام اخلاق درحقیقت انسان کی طبعی حالتیں اور طبعی جذبات ہیں۔ اور صرف اس وقت اخلاق کے نام سے موسوم ہوتے ہیں۔ کہ جب محل اور موقع کے لحاظ سے بالارادہ ان کو استعمال کیا جاوے۔ چونکہ انسان کے طبعی خواص میں سے ایک یہ بھی خاصہ ہے۔ کہ وہ ترقی پذیر جاندار ہے اس لئے وہ سچے مذہب کی پیروی اور نیک صحبتوں اور نیک تعلیموں سے ایسے طبعی جذبات کو اخلاق کے رنگ میں لے آتا ہے۔ اور یہ امر کسی اور جاندار کے لئے نصیب نہیں ؞

اصلاح اوّل یعنی طبعی حالتیں

اب ہم منجملہ قرآن شریف کی اصلاحات ثلاثہ کے پہلی اصلاح کو جو ادنےٰ درجہ کی طبعی حالتوں کے متعلق ہے۔ ذکر کرتے ہیں۔ اور یہ اصلاح اخلاق کے شعبوں میں سے وہ شعبہ ہے جو ادب کے نام سے موسوم ہے یعنی وہ ادب جس کی پابندی وحشیوں کو اُن کی طبعی حالتوں کھانے پینے اور شادی کرنے وغیرہ تمدنی امور میں مرکز اعتدال پر لاتی ہے اور اس زندگی سے نجات بخشتی ہے جو وحشیانہ اور چارپایوں یا درندوں کی طرح ہو۔ جیسا کہ ان آداب کے بارے میں اللہ جلشانہٗ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ اُمَّھٰتُکُمْ وَ بَنٰتُکُمْ وَ اَخَوٰتُکُمْ وَ عَمّٰتُکُمْ وَ خٰلٰتُکُمْ وَ بَنٰتُ الْاَخِ وَ بَنٰتُ الْاُخْتِ وَ اُمَّھٰتُکُمُ الّٰتِیْٓ اَرْضَعْنَکُمْ وَ اَخَوٰتُکُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ اُمَّھٰتُ نِسَآئِکُمْ وَ رَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ مِّنْ نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِھِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَکُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِھِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْکُمْ وَ حَلَآئِلُ اَبْنَآئِکُمُ الَّذِیْنَ مِنْ اَصْلَابِکُمْ وَ اَنْ تَجْمَعُوْا بَیْنَ الْاُخْتَیْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ۔ لَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرْھًا۔ وَلَا تَنْکِحُوْا مَا نَکَحَ اٰبَآؤُکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ۔ اُحِلَّ لَکُمُ الطَّیِّبٰتُ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَ الْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ

مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ
وَلَا مُتَّخِذِيْٓ اَخْدَانٍ ؕ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ لَا
تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا
فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِيْهَآ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ
ارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاِذَا حُيِّيْتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوْا
بِاَحْسَنَ مِنْهَآ اَوْ رُدُّوْهَا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ
رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ
الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوْذَةُ
وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيْحَةُ وَمَآ اَكَلَ السَّبُعُ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَآ
اُحِلَّ لَهُمْ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۔ وَاِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا
وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا وَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا
وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ
تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ
حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ؕ وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا
طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا
فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ؕ وَاٰتُوا النِّسَآءَ
صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ۔ ترجمہ یعنی تم پر تمہاری مائیں حرام کی گئیں اور ایسے ہی تمہاری
بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور تمہاری بھتیجیاں اور
تمہاری بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا اور تمہاری بہنیں
اور تمہاری بیویوں کی مائیں۔ اور تمہاری بیویوں کے پہلے خاوند سے لڑکیاں جن سے
تم ہم صحبت ہو چکے ہو۔ اور اگر تم ان سے ہم صحبت نہیں ہوئے تو کوئی گناہ نہیں اور
تمہارے حقیقی بیٹوں کی عورتیں۔ اور ایسے ہی دو بہنیں ایک وقت میں یہ سب کام
جو پہلے ہو گئے تھے۔ آج تم پر حرام کئے گئے۔ یہ بھی تمہارے لئے جائز نہ ہوگا۔ کہ جبرًا

۱ شراب ۲ قماربازی۔ جوا ۳ بت پرستی ۴ شگون لینے ۱۲

عورتوں کے وارث بنجاؤ۔ یہ بھی جائز نہیں۔ کہ تم ان عورتوں کو نکاح میں لاؤ۔ جو تمہارے
باپوں کی بیویاں تھیں۔ جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا۔ پاکدامن عورتیں تم میں سے یا پہلے
اہل کتاب میں سے تمہارے لئے حلال ہیں کہ ان سے شادی کرو۔ لیکن جب مہر قرار
پاکر نکاح ہو جائے۔ بدکاری جائز نہیں۔ اور نہ چھپا ہوا یارانہ۔" عرب کے
جاہلوں میں جس شخص کے اولاد نہ ہوتی تھی۔ بعض میں یہ رسم تھی۔ کہ انکی بیوی
اولاد کے لئے دوسرے سے آشنائی کرتی۔ قرآن شریف نے اس صورت کو حرام

[illegible]

کر دیا مسفحٰت اسی بد رسم کا نام ہے۔ پھر فرمایا۔ کہ تم خودکشی نہ کرو۔ اپنی اولاد کو
قتل نہ کرو۔ اور دوسرے گھروں میں وحشیوں کی طرح خود بخود بلے اجازت نہ چلے
جاؤ۔ اجازت لینا شرط ہے۔ اور جب تم دوسروں کے گھروں میں جاؤ۔ تو داخل
ہوتے ہی السلام علیکم کہو۔ اور اگر ان گھروں میں کوئی نہ ہو تو جب تک کوئی مالک
خانہ تمہیں اجازت نہ دے۔ ان گھروں میں مت جاؤ۔ اور اگر مالک خانہ یہ کہے۔ کہ
واپس چلے جاؤ۔ تو تم واپس چلے جاؤ۔ اور گھروں میں دیواروں پر سے کود کر نہ جایا کرو۔
بلکہ گھروں میں ان گھروں کے دروازہ میں سے جاؤ۔ اور اگر کوئی تمہیں سلام کہے تو اسکو
سے بہتر اور نیک تر اس کو سلام کہو۔ شراب اور قمار بازی اور بُت پرستی اور شگون
لینا یہ سب پلید اور شیطانی کام ہیں۔ ان سے بچو۔ مُردار مت کھاؤ۔ خنزیر کا گوشت
مت کھاؤ۔ بتوں کے چڑھاوے مت کھاؤ۔ لاٹھی سے مارا ہوا مت کھاؤ۔ گر کے مرا
ہوا مت کھاؤ۔ سینگ لگنے سے مرا ہوا مت کھاؤ۔ درندہ کا پھاڑا ہوا مت کھاؤ
بُت پر چڑھایا ہوا مت کھاؤ۔ کیونکہ یہ سب مردار کا حکم رکھتے ہیں۔ اور اگر یہ لوگ
پوچھیں۔ کہ پھر کھائیں کیا۔ تو جواب یہ دے کہ دنیا کی تمام پاک چیزیں کھاؤ۔ صرف مردار
اور مُردار کے مشابہ اور پلید چیزیں مت کھاؤ۔ اگر مجلسوں میں تمہیں کہا جائے۔ کہ
کشادہ ہو کر بیٹھو یعنی دوسروں کو جگہ دو۔ تو جلد جگہ کشادہ کر دو۔ تا دوسرے بیٹھیں
اور اگر کہا جائے۔ کہ تم اٹھ جاؤ۔ تو پھر بغیر چون و چرا کے اٹھ جاؤ۔ گوشت دال وغیرہ
سب چیزیں جو پاک ہوں۔ بیشک کھاؤ۔ مگر ایک طرف کی کثرت مت کرو۔ اور

اسراف اور زیادہ خوری سے اپنے تئیں بچاؤ۔ لغو باتیں مت کیا کرو۔ محل اور موقع کی بات کیا کرو۔ اپنے کپڑے صاف رکھو بدن کو اور گھر کو اور کوچہ کو اور ہر ایک جگہ کو جہاں تمہاری نشست ہو۔ پلیدی اور میل کچیل اور کثافت سے بچاؤ۔ یعنی غسل کرتے رہو۔ اور گھروں کو صاف رکھنے کی عادت پکڑو۔ نہ بہت اونچا بولا کرو۔ نہ بہت نیچا درمیان کو نگاہ رکھو۔ یعنی باستثناء وقت ضرورت کے چلنے میں بھی نہ بہت تیز چلو اور نہ بہت آہستہ۔ درمیان کو نگاہ رکھو۔ جب سفر کرو۔ تو ہر ایک طور پر سفر کا انتظام کر لیا کرو۔ اور کافی زاد راہ لے لیا کرو تا گداگری سے بچو۔ جنابت کی حالت میں غسل کر لیا کرو۔ جب روٹی کھاؤ تو سائل کو بھی دو۔ اور کتے کو بھی ڈال دیا کرو۔ اور دوسرے پرند وغیرہ کو بھی۔ اگر موقع ہو۔ یتیم لڑکیاں جنکی تم پرورش کرو۔ ان سے نکاح کرنا مضائقہ نہیں لیکن اگر تم دیکھو کہ چونکہ وہ لاوارث ہیں۔ شائد تمہارا نفس انپر زیادتی کرے تو ماں باپ اور اقارب والی عورتیں کرو۔ جو تمہاری مؤدب رہیں۔ اور ان کا تمہیں خوف رہے۔ ایک دو تین چار تک کر سکتے ہو۔ بشرطیکہ اعتدال کرو اور اگر اعتدال نہ ہو۔ تو پھر ایک ہی پر کفائت کرو۔ گو ضرورت پیش آوے۔ چار کی حد جو لگا دی گئی ہے وہ اس مصلحت سے ہے کہ تا تم پرانی عادت کے تقاضے سے افراط نہ کرو۔ یعنی صدہا تک نوبت نہ پہنچاؤ۔ یا یہ کہ حرامکاری کیطرف جھک نہ جاؤ۔ اور اپنی عورتوں کو مہر دو۔ غرض یہ قرآن شریف کی پہلی اصلاح ہے۔ جس میں انسان کی طبعی حالتوں کو وحشیانہ طریقوں سے کھینچکر انسانیت کے لوازم اور تہذیب کیطرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اس تعلیم میں ابھی اعلےٰ اخلاق کا کچھ ذکر نہیں۔ صرف انسانیت کے آداب ہیں۔ اور ہم لکھ چکے ہیں۔ کہ اس تعلیم کی یہ ضرورت پیش آئی تھی۔ کہ ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم جس قوم کی اصلاح کے لئے آئے تھے۔ وہ وحشیانہ حالت میں سب قوموں سے بڑھی ہوئی تھی کسی پہلو میں انسانیت کا طریق ان میں قائم نہیں رہا تھا پس ضرور تھا۔ کہ سب سے پہلے انسانیت کے ظاہری ادب انکو سکھلائے جاتے ÷

ایک نکتہ اس جگہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ اور وہ نکتہ یہ ہے کہ خنزیر جو حرام کیا گیا ہے۔ خدا نے ابتدا سے اسکے نام میں ہی حرمت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کیونکہ خنزیر کا لفظ خنز اور آر سے مرکب ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ میں اسکو بہت فاسد اور خراب دیکھتا ہوں۔ خنز کے معنی بہت فاسد اور آر کے معنی دیکھتا ہوں۔ پس اس جانور کا نام جو ابتدا سے خدا تعالیٰ کیطرف سے اسکو ملا ہے۔ وہی اسکی پلیدی پر دلالت کرتا ہے۔ اور عجیب اتفاق یہ ہے کہ ہندی میں اس جانور کو سُور کہتے ہیں۔ یہ لفظ بھی سُو اور آر سے مرکب ہے جس کے معنی یہ ہیں۔ کہ میں اس کو بہت بُرا دیکھتا ہوں۔ اس سے تعجب نہیں کرنا چاہیئے کہ سُو کا لفظ عربی کیونکر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہم نے اپنی کتاب منن الرحمٰن میں ثابت کیا ہے کہ تمام زبانوں کی ماں عربی زبان ہے۔ اور عربی کے لفظ ہر ایک زبان میں نہ ایک نہ دو۔ بلکہ ہزاروں ملے ہوئے ہیں سُو عربی لفظ ہے اسی لئے ہندی میں سُور کا ترجمہ بد ہے پس اس جانور کو بد بھی کہتے ہیں۔ اسمیں کچھ شک معلوم نہیں ہوتا ہے۔ کہ اس زمانہ میں جبکہ تمام دنیا کی زبان عربی تھی۔ اس ملک میں یہ نام اس جانور کا عربی میں مشہور تھا۔ جو خنزیر کے نام سے ہم معنی ہے۔ پھر اب تک یادگار باقی رہ گیا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ شاستری میں اس کے قریب قریب ہی لفظ متغیر ہو کر اور کچھ بن گیا ہو۔ مگر صحیح لفظ یہی ہے کیونکہ اپنی وجہ تسمیہ ساتھ رکھتا ہے۔ جس پر لفظ خنزیر گواہ ناطق ہے اور یہ معنی جو اس لفظ کے ہیں۔ یعنی بہت فاسد۔ اس کی تشریح کی حاجت نہیں اس بات کا کس کو علم نہیں۔ کہ یہ جانور اوّل درجہ کا نجاست خوار اور نیز بے غیرت اور دیوث ہے۔ اب اسکے حرام ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ قانون قدرت یہی چاہتا ہے کہ ایسے پلید اور بد جانور کے گوشت کا اثر بھی بدن اور روح پر پلید ہی ہو کیونکہ ہم ثابت کر چکے ہیں۔ کہ غذاؤں کا بھی انسان کی روح پر ضرور اثر ہوتا ہے پس اسمیں کیا شک ہے کہ ایسے بد کا اثر بھی بد ہی پڑے گا۔ جیسا کہ یونانی طبیبوں نے

اسلام سے پہلے ہی یہ رائے ظاہر کی ہے۔ کہ اس جانور کا گوشت بالخاصیت حیا
کی قوت کو کم کرتا ہے۔ اور دیوثی کو بڑھاتا ہے۔ اور مردار کا کھانا بھی اسی لئے اس
شریعت میں منع ہے کہ مردار بھی کھانے والے کو اپنے رنگ میں لاتا ہے۔ اور نیز
ظاہری صحت کے لئے بھی مضر ہے۔ اور جن جانوروں کا خون اندر ہی رہتا ہے
جیسے گلا گھونٹا ہوا۔ یا لاٹھی سے مارا ہوا یہ تمام جانور درحقیقت مردار کے حکم
میں ہی ہیں۔ کیا مردہ کا خون اندر رہنے سے اپنی حالت پر رہ سکتا ہے؟ نہیں
بلکہ وہ بوجہ مرطوب ہونے کے بہت جلد گندہ ہوگا۔ اور اپنی عفونت سے تمام
گوشت کو خراب کریگا۔ اور نیز خون کے کیڑے جو حال کی تحقیقات سے بھی ثابت
ہوئے ہیں۔ مرکر ایک زہرناک عفونت بدن میں پھیلا دیں گے ؛

انسان کی اخلاقی حالتیں

دوسرا حصہ قرآنی اصلاح کا یہ ہے۔ کہ طبعی حالتوں کو شرائط
مناسب کے ساتھ مشروط کرکے اخلاق فاضلہ تک پہنچایا جائے۔ سو واضح ہو
کہ یہ حصہ بہت بڑا ہے۔ اگر ہم اس حصہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کریں۔ یعنی تمام
وہ اخلاق اس جگہ لکھنا چاہیں۔ جو قرآن شریف نے بیان کئے تو یہ مضمون اس
قدر لمبا ہو جائے گا۔ کہ وقت اس کے دسویں حصہ تک کو بھی کفایت نہیں کرے گا
اس لئے چند اخلاق فاضلہ نمونہ کے طور پر بیان کئے جاتے ہیں ؛

اب جاننا چاہیئے۔ کہ اخلاق دو قسم کے ہیں۔ اوّل وہ اخلاق جن کے ذریعہ
سے انسان ترک شر پر قادر ہوتا ہے۔ دوسرے وہ اخلاق جنکے ذریعہ
سے انسان ایصال خیر پر قادر ہوتا ہے۔ اور ترک شر کے مفہوم میں وہ اخلاق
داخل ہیں۔ جن کے ذریعہ سے انسان کوشش کرتا ہے۔ کہ تا اپنی زبان یا
اپنے ہاتھ یا اپنی آنکھ یا اپنے کسی اور عضو سے دوسرے کے مال یا عزت یا جان

اخلاق کی دو قسم

کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ یا نقصان رسانی اور کسرِ شان کا ارادہ نہ کر سکے۔ اور ایصالِ خیر کے مفہوم میں تمام وہ اخلاق داخل ہیں۔ جن کے ذریعہ سے انسان کوشش کرتا ہے۔ کہ اپنی زبان یا اپنے ہاتھ یا اپنے مال یا اپنے علم یا کسی اور ذریعہ سے دوسرے کے مال یا عزت کو فائدہ پہنچا سکے یا اس کے جلال یا عزت ظاہر کرنے کا ارادہ کر سکے۔ یا اگر کسی نے اس پر کوئی ظلم کیا تھا۔ تو جس سزا کا وہ ظالم مستحق تھا۔ اس سے درگذر کر سکے۔ اور اس طرح اس کو دُکھ اور عذابِ بدنی اور تاوانِ مالی سے محفوظ رہنے کا فائدہ پہنچا سکے۔ یا اُس کو ایسی سزا دے سکے جو حقیقت میں اس کے لئے سراسر رحمت ہے +

اخلاق ترکِ شر کی تفصیل

اب واضح ہو کہ وہ اخلاق جو ترکِ شر کے لئے صانعِ حقیقی نے مقرر فرمائے ہیں۔ وہ زبانِ عربی میں جو تمام انسانی خیالات اور اوضاع اور اخلاق کے اظہار کے لئے ایک ایک مفرد لفظ اپنے اندر رکھتی ہے۔ چار ناموں سے موسوم ہیں۔ چنانچہ پہلا خلق احصان کے نام سے موسوم ہے۔ اور اس لفظ سے مراد خاص وہ پاکدامنی ہے۔ جو مرد اور عورت کی قوتِ تناسل سے تعلق رکھتی ہے۔ اور محصن یا محصنہ اس مرد یا اس عورت کو کہا جائیگا کہ جو حرامکاری یا اس کے مقدمات سے مجتنب رہکر اس ناپاک بدکاری سے اپنے تئیں روکیں۔ جس کا نتیجہ دونوں کے لئے اس عالم میں ذلت اور لعنت اور دوسرے جہان میں عذابِ آخرت اور متعلقین کے لئے علاوہ بے آبروئی نقصان شدید ہے۔ مثلاً جو شخص کسی کی بیوی سے اس ناجائز حرکت کا مرتکب ہو یا مثلاً زنا تو نہیں۔ مگر اسکے مقدمات مرد اور عورت دونوں سے ظہور میں آویں۔ تو کچھ شک نہیں کہ اس غیرتمند مظلوم کی ایسی بیوی کو جو زنا کرانے پر راضی ہو گئی تھی۔ یا زنا بھی واقع ہو چکا تھا طلاق دینی پڑیگی۔ اور بچوں پر بھی اگر اس عورت کے پیٹ سے ہوں گے۔ بڑا تفرقہ پڑے گا۔ اور مالکِ خانہ یہ تمام نقصان اس بدذات کی وجہ سے اُٹھائے گا +

احصان کے نقصان کی مثال

اس جگہ یاد رہے۔ کہ یہ خلق جس کا نام احصان ہے۔ عفت ہے یعنی پاکدامنی یہ اسی حالت میں خلق کہلائیگا۔ جبکہ ایسا شخص جو بدنظری یا بدکاری کی استعداد اپنے اندر رکھتا ہے۔ یعنی قدرت نے وہ قوٰی اس کو دے رکھے ہیں۔ جن کے ذریعہ سے اس جرم کا ارتکاب ہو سکتا ہے۔ اس فعل شنیع سے اپنے تئیں بچائے۔ اور اگر بباعث بچہ ہونے یا نامرد ہونے یا خوجہ ہونے یا پیر فرتوت ہونے کے یہ قوت اس میں موجود نہ ہو۔ تو اس صورت میں ہم اس کو اس خلق سے جس کا نام احصان یا عفت ہے موسوم نہیں کر سکتے۔ ہاں یہ ضرور ہے۔ کہ عفت اور احصان کی اسما میں ایک طبعی حالت ہے۔ مگر ہم بار بار لکھ چکے ہیں کہ طبعی حالتیں خلق کے نام سے موسوم نہیں ہو سکتیں۔ بلکہ اس وقت خلق کی حد میں داخل کی جائینگی۔ جبکہ عقل کے زیر سایہ ہو کر اپنے محل پر صادر ہوں۔ یا صادر ہونے کی قابلیت پیدا کر لیں۔ لہذا جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں۔ کہ بچے اور نامرد اور ایسے لوگ جو کسی تدبیر سے اپنے تئیں نامرد کر لیں۔ اس خلق کا مصداق نہیں ٹھہر سکتے۔ گو بظاہر عفت اور احصان کے رنگ میں اپنی زندگی بسر کریں۔ بلکہ ان تمام صورتوں میں انکی عفت اور احصان کا نام طبعی حالت ہوگا۔ نہ اور کچھ۔ اور چونکہ یہ ناپاک حرکت اور اس کے مقدمات جیسے مرد سے صادر ہو سکتے ہیں۔ ویسے ہی عورت سے بھی صادر ہو سکتے ہیں۔ لہذا خدا کی پاک کتاب میں دونوں مرد اور عورت کے لئے یہ تعلیم فرمائی گئی ہے قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَیَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُیُوْبِهِنَّ وَلَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ ؕ وَتُوْبُوْۤا اِلَى اللّٰهِ جَمِیْعًا اَیُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۞ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰۤى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَسَآءَ سَبِیْلًا ۞ وَلْیَسْتَعْفِفِ الَّذِیْنَ لَا یَجِدُوْنَ نِكَاحًا وَرَهْبَانِیَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَایَتِهَا

قرآن شریف میں پاکدامنی کی تعلیم

یعنی ایمانداروں کو جو مرد ہیں۔ کہدے کہ آنکھوں کو نامحرم عورتوں کے دیکھنے سے بچائے رکھیں۔ اور ایسی عورتوں کو کھلے طور سے نہ دیکھیں جو شہوت کا محل ہو سکتی ہوں۔ اور ایسے موقعوں پر خوابیدہ نگاہ کی عادت پکڑیں۔ اور اپنے ستر کی جگہ کو جس طرح ممکن ہو بچاویں۔ ایسے ہی کانوں کو نامحرموں سے بچائیں یعنی بیگانہ عورتوں کے گانے بجانے اور خوش الحانی کی آوازیں نہ سنیں۔ ان کے حسن کے قصے نہ سنیں یہ طریق پاک نظر اور پاک دل رہنے کے لئے عمدہ طریق ہے ایسا ہی ایماندار عورتوں کو کہدے۔ کہ وہ بھی اپنی آنکھوں کو نامحرم مردوں کے دیکھنے سے بچائیں اور اپنے کانوں کو بھی نامحرموں سے بچائیں یعنی ان کی پُر شہوات آوازیں نہ سنیں۔ اور اپنے ستر کی جگہوں کو پردہ میں رکھیں اور اپنے زینت کے اعضاء کو کسی غیر محرم پر نہ کھولیں اور اپنی اوڑھنی کو اس طرح سر پر لیں۔ کہ گریبان سے ہو کر سر پر آجاوے۔ یعنی گریبان اور دونوں کان اور سر اور کنپٹیاں سب چادر کے پردہ میں رہیں اور اپنے پیروں کو زمین پر ناچنے والوں کی طرح نہ ماریں۔ یہ وہ تدبیر ہے کہ جس کی پابندی ٹھوکر سے بچا سکتی ہے اور دوسرا طریق بچنے کے لئے یہ ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔ اور اس سے دعا کریں تا ٹھوکر سے بچاوے اور لغزشوں سے نجات دے۔ زنا کے قریب مت جاؤ۔ یعنی ایسی تقریبوں سے دور رہو جن سے یہ خیال بھی دل میں پیدا ہو سکتا ہو۔ اور ان راہوں کو اختیار نہ کرو۔ جن سے اس گناہ کے وقوع کا اندیشہ ہو۔ جو زنا کرتا ہے۔ وہ بدی کو انتہا تک پہنچا دیتا ہے زنا کی راہ بہت بُری راہ ہے۔ یعنی منزل مقصود سے روکتی ہے اور تمہاری آخری منزل کے لئے سخت خطرناک ہے۔ اور جس کو نکاح میسر نہ آوے۔ چاہیئے کہ وہ اپنی عفت کو دوسرے طریقوں سے بچاوے۔ مثلاً روزہ رکھے یا کم کھاوے یا اپنی طاقتوں سے تن آزار کام لے۔ اور اور لوگوں نے یہ بھی طریق نکالے ہیں کہ وہ ہمیشہ عمداً نکاح سے دست بردار رہیں۔ یا خوجے بنیں۔ اور کسی طریق سے رہبانیت اختیار کریں مگر ہم نے انسان پر یہ حکم فرض نہیں کئے۔ اسی لئے وہ ان بدعتوں کو پورے طور پر

نباہ نہ سکے۔ خدا کا یہ فرمانا کہ ہمارا یہ حکم نہیں کہ لوگ خوجے بنیں۔ یہ اس بات کیطرف
اشارہ ہے۔ کہ اگر خدا کا حکم ہوتا۔ تو سب لوگ اس حکم پر عمل کرنے کے مجاز بنتے
تو اس صورت میں بنی آدم کی قطع نسل ہو کر کبھی کا دنیا کا خاتمہ ہو جاتا۔ اور نیز اگر
اس طرح پر عفت حاصل کرنی ہو کہ عضو مردی کو کاٹ دیں۔ تو یہ در پردہ اس صانع
پر اعتراض ہے جس نے وہ عضو بنایا۔ اور نیز جبکہ ثواب کا تمام مدار اس بات
پر ہے۔ کہ ایک قوت موجود ہو۔ اور پھر انسان خدا تعالیٰ کا خوف کر کے اس قوت کے
خراب جذبات کا مقابلہ کرتا ہے۔ اور اس کے منافع سے فائدہ اُٹھا کر دو طور کا
ثواب حاصل کرے۔ پس ظاہر ہے۔ کہ ایسے عضو کے ضائع کر دینے میں دونوں ثوابوں
سے محروم رہا۔ ثواب تو جذبہ مخالفانہ کے وجود اور پھر اس کے مقابلہ سے ملتا ہے۔
مگر جس میں بچہ کی طرح وہ قوت ہی نہیں رہی۔ اس کو کیا ثواب ملے گا۔ کیا بچہ کو اپنی
عفت کا ثواب مل سکتا ہے +

ان آیات میں خدا تعالیٰ نے خلق احصان یعنی عفت کے حاصل کرنے کے لئے
صرف اعلیٰ تعلیم ہی نہیں فرمائی۔ بلکہ اپنے تئیں پاکدامن رہنے کے لئے پانچ علاج
بھی بتلا دیئے ہیں یعنی یہ کہ اپنی آنکھوں کو نامحرم پر نظر ڈالنے سے بچانا۔ کانوں کو
نامحرموں کی آواز سننے سے بچانا۔ نامحرموں کے قصے نہ سننا۔ اور دوسری تمام
تقریبوں سے جن میں اس بدفعل کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو اپنے تئیں بچانا
اگر نکاح نہ ہو۔ تو روزہ رکھنا وغیرہ +

اس جگہ ہم بڑے دعوے سے کہتے ہیں۔ کہ یہ اعلیٰ تعلیم ان سب تدبیروں کے
ساتھ جو قرآن شریف نے بیان فرمائی ہیں۔ صرف اسلام سے ہی خاص ہے۔ اور اس جگہ
ایک نکتہ یاد رکھنے کے لائق ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ کہ چونکہ انسان کی وہ طبعی حالت
جو شہوات کا منبع ہے جس سے انسان بغیر کسی کامل تغیر کے الگ نہیں ہو سکتا یہی
ہے کہ اس کے جذبات شہوت محل اور موقع پا کر جوش مارنے سے رہ نہیں سکتے۔ یا
یوں کہو۔ کہ سخت خطرہ میں پڑ جاتے ہیں۔ اس لئے خدا تعالیٰ نے ہمیں یہ تعلیم نہیں

دی۔ کہ ہم نامحرم عورتوں کو بلا تکلف دیکھ لیا کریں۔ اور ان کی تمام زینتوں پر نظر
ڈال لیں۔ اور ان کے تمام انداز ناچنا وغیرہ مشاہدہ کر لیں۔ لیکن پاک نظر سے
دیکھیں۔ اور نہ یہ تعلیم ہمیں دی ہے کہ ہم ان بیگانہ جوان عورتوں کا گانا بجانا
سن لیں۔ اور ان کے حسن کے قصے بھی سنا کریں۔ لیکن پاک خیال سے سنیں
بلکہ ہمیں تاکید ہے۔ کہ ہم نامحرم عورتوں کو اور انکی زینت کی جگہ کو ہرگز نہ دیکھیں
نہ پاک نظر سے اور نہ ناپاک نظر سے۔ اور انکی خوش الحانی کی آوازیں اور ان کے
حسن کے قصے نہ سنیں نہ پاک خیال سے۔ نہ ناپاک خیال سے۔ بلکہ ہمیں چاہیئے
کہ ان کے سننے اور دیکھنے سے نفرت رکھیں جیسا کہ مردار سے۔ تا ٹھوکر نہ کھاویں
کیونکہ ضرور ہے۔ کہ بے قیدی کی نظروں سے کسی وقت ٹھوکریں پیش آویں۔ سو
چونکہ خدا تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہماری آنکھیں اور دل اور ہمارے خطرات سب پاک
رہیں۔ اس لئے اس نے یہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم فرمائی۔ اس میں کیا شک ہے۔ کہ
بے قیدی ٹھوکر کا موجب ہو جاتی ہے۔ اگر ہم ایک بھوکے کتے کے آگے نرم نرم
روٹیاں رکھ دیں۔ اور پھر امید رکھیں۔ کہ اس کتے کے دل میں خیال تک ان
روٹیوں کا نہ آوے۔ تو ہم اپنے اس خیال میں غلطی پر ہیں۔ سو خدا تعالیٰ نے چاہا
کہ نفسانی قویٰ کو پوشیدہ کارروائیوں کا موقع بھی نہ ملے۔ اور ایسی کوئی بھی
تقریب پیش نہ آوے۔ جس سے بد خطرات جنبش کر سکیں +

اسلامی پردہ کی فلاسفی

اسلامی پردہ کی یہی فلاسفی اور یہی ہدایت شرعی ہے۔ خدا کی کتاب میں پردہ
سے یہ مراد نہیں۔ کہ فقط عورتوں کو قیدیوں کی طرح حراست میں رکھا جائے
یہ ان نادانوں کا خیال ہے۔ جنکو اسلامی طریقوں کی خبر نہیں۔ بلکہ مقصود یہ
ہے کہ عورت مرد دونوں کو آزاد نظر اندازی اور اپنی زینتوں کے دکھانے سے
روکا جائے کیونکہ اس میں دونوں مرد اور عورت کی بھلائی ہے۔ بالآخر یاد
رہے۔ کہ خوابیدہ آنکھ سے غیر محل پر نظر ڈالنے سے اپنے تئیں بچا لینا۔ اور دوسری
جائز النظر چیزوں کو دیکھنا اس طریق کو عربی میں غض بصر کہتے ہیں۔ اور ہر ایک

پرہیزگار جو اپنے دل کو پاک رکھنا چاہتا ہے۔ اس کو نہیں چاہیئے۔ کہ حیوانوں کیطرح جس طرف چاہے۔ بے محابا نظر اُٹھا کر دیکھ لیا کرے۔ بلکہ اس کے لئے اس تمدنی زندگی میں غضِ بصر کی عادت ڈالنا ضروری ہے۔ اور یہ وہ مبارک عادت ہے جس سے اس کی یہ طبعی حالت ایک بھاری خلق کے رنگ میں آجائیگی۔ اور اس کی تمدنی ضرورت میں بھی فرق نہیں پڑے گا۔ یہی وہ خلق ہے جس کو احصان اور عفت کہتے ہیں ؛

قسم دوم ترک شر امانت و دیانت

دوسری قسم ترکِ شر کے اقسام میں سے وہ خُلق ہے جسکو امانت و دیانت کہتے ہیں یعنی دوسرے کے مال پر شرارت اور بدنیتی سے قبضہ کر کے اس کو ایذا پہنچانے پر راضی نہ ہونا۔ سو واضح ہو۔ کہ دیانت اور امانت انسان کی طبعی حالتوں میں سے ایک حالت ہے۔ اسی واسطے ایک بچہ شیر خوار بھی بوجہ کم سنی اپنی طبعی سادگی پر ہوتا ہے۔ اور نیز بباعث صغر سنی ابھی بُری عادتوں کا عادی نہیں ہوتا۔ اس قدر غیر کی چیز سے نفرت رکھتا ہے کہ غیر عورت کا دودھ بھی مشکل سے پیتا ہے اور اگر بیہوشی کے زمانہ میں کوئی اور دایہ مقرر نہ ہو۔ تو ہوش کے زمانہ میں اسکو دوسرے کا دودھ پلانا نہایت مشکل ہو جاتا ہے۔ اور اپنی جان پر بہت تکلیف اُٹھاتا ہے۔ اور ممکن ہے کہ اس تکلیف سے مرنے کے قریب ہو جائے۔ مگر دوسری عورت کے دودھ سے طبعاً بیزار ہوتا ہے۔ اس قدر نفرت کا کیا بھید ہے؟ بس یہی کہ وہ والدہ کو چھوڑ کر غیر کی چیز کی طرف رجوع کرنے سے طبعاً متنفر ہے۔ اب ہم جب ایک گہری نظر سے بچہ کی اس عادت کو دیکھتے اور اس پر غور کرتے ہیں اور فکر کرتے کرتے اسکی اس عادت کی تہ تک چلے جاتے ہیں۔ تو ہم پر صاف کھل جاتا ہے۔ کہ یہ عادت جو غیر کی چیز سے اس قدر نفرت کرتا ہے۔ کہ اپنے اوپر مصیبت ڈال لیتا ہے۔ یہی جڑھ دیانت اور امانت کی ہے۔ اور دیانت کے خُلق میں کوئی شخص راستباز نہیں ٹھہر سکتا۔ جب تک بچہ کیطرح غیر کے مال کے بارے میں بھی سچی نفرت اور کراہت اس کے دل میں پیدا نہ ہو جائے۔ لیکن بچہ اس عادت کو اپنے محل پر استعمال نہیں کرتا اور اپنی بیوقوفی کے سبب سے بہت کچھ تکلیفیں اُٹھا لیتا ہے لہٰذا!

اسکی یہ عادت صرف ایک حالت طبعی ہے۔ جسکو وہ بے اختیار ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے وہ حرکت اُس کے خُلق میں داخل نہیں ہو سکتی۔ گو انسانی سرشت میں اصل جڑھ خلق دیانت اور امانت کی وہی ہے جیسا کہ بچہ اس غیر معقول حرکت سے متدین اور امین نہیں کہلا سکتا۔ ایسا ہی وہ شخص بھی اس خلق سے متصف نہیں ہو سکتا۔ جو اس طبعی حالت کو محل پر استعمال نہیں کرتا۔ امین اور دیانتدار بننا بہت نازک امر ہے۔ جب تک انسان تمام پہلو بجا نہ لاوے۔ امین اور دیانتدار نہیں ہو سکتا۔ اس میں اللہ تعالےٰ نے نمونہ کے طور پر آیات مفصلہ ذیل میں امانت کا طریق سمجھایا ہے۔ اور وہ طریق امانت یہ ہے۔ وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا ۝ وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُمْ مِنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ۝ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ۝ ترجمہ یعنی اگر کوئی ایسا تم میں مالدار ہو جو صحیح العقل نہ ہو مثلاً یتیم یا نابالغ ہو۔ اور اندیشہ ہو۔ کہ وہ اپنی حماقت سے اپنے مال کو ضائع کر دیگا۔ تو تم بطور کورٹ آف وارڈس کے وہ تمام مال اس کا متکفل کے طور پر اپنے قبضہ میں لے لو۔ اور وہ تمام مال جس پر سلسلہ تجارت اور معیشت کا چلتا ہے۔ ان بیوقوفوں کے حوالہ مت کرو۔ اور اس مال میں سے بقدر ضرورت ان کے کھانے اور پہننے کے لئے دیدیا کرو۔ اور ان کو اچھی باتیں قول معروف کی کہتے رہو۔ یعنی ایسی

(حاشیہ: قرآن میں امانت و دیانت کی تعلیم)

جن سے انکی عقل و تمیز بڑھے اور ایک طور سے انکے مناسب حال انکی تربیت ہو جائے اور جاہل اور ناتجربہ کار نہ رہیں۔ اگر وہ تاجر کے بیٹے ہیں۔ تو تجارت کے طریقے انکو سکھاؤ۔ اور اگر کوئی اور پیشہ رکھتے ہوں تو اس پیشہ کے مناسب حال انکو پختہ کردو۔ غرض ساتھ ساتھ ان کو تعلیم دیتے جاؤ۔ اور اپنی تعلیم کو وقتاً فوقتاً امتحان بھی کرتے جاؤ۔ کہ جو کچھ تم نے سکھلایا۔ انہوں نے سمجھا بھی ہے یا نہیں۔ پھر جب نکاح کے لائق ہو جاویں۔ یعنی عمر قریباً اٹھارہ برس تک پہنچ جائے۔ اور تم دیکھو کہ ان میں اپنے مال کے انتظام کی عقل پیدا ہو گئی ہے۔ تو ان کا مال انکے حوالہ کردو۔ اور فضول خرچی کے طور پر ان کا مال خرچ نہ کرو۔ اور نہ اس خوف سے جلدی کر کے کہ اگر یہ بڑے ہو جائینگے۔ تو اپنا مال لے لینگے۔ انکے مال کا نقصان کرو۔ جو شخص دولتمند ہو۔ اس کو نہیں چاہیئے۔ کہ انکے مال میں سے کچھ حق الخدمت لیوے۔ لیکن ایک محتاج بطور معروف لے سکتا ہے۔ عرب میں مالی محافظوں کے لئے یہ طریق معروف تھا کہ اگر یتیموں کے کار پرداز ان کے مال میں سے لینا چاہتے۔ تو حتی الوسع یہ قاعدہ جاری رکھتے۔ کہ جو کچھ یتیم کے مال کو تجارت سے فائدہ ہوتا۔ اس میں سے آپ بھی لیتے راس المال کو تباہ نہ کرتے۔ سو یہ اسی عادت کیطرف اشارہ ہے۔ کہ تم بھی ایسا کرو۔ اور پھر فرمایا۔ کہ جب تم یتیموں کو مال واپس کرنے لگو۔ تو گواہوں کے روبرو ان کو ان کا مال دو۔ اور جو شخص فوت ہونے لگے۔ اور بچے اسکے ضعیف اور صغیر السن ہوں تو اسکو نہیں چاہیئے۔ کہ کوئی وصیت کرے۔ کہ جس میں بچوں کی حق تلفی ہو۔ جو لوگ ایسے طور سے یتیم کا مال کھاتے ہیں جس سے یتیم پر ظلم ہو جائے وہ مال نہیں بلکہ آگ کھاتے ہیں۔ اور آخر جلانے والی آگ میں ڈالے جائینگے۔

اب دیکھو خدا تعالیٰ نے دیانت اور امانت کے کس قدر پہلو بتلائے۔ سو حقیقی دیانت اور امانت یہی ہے۔ جو ان تمام پہلوؤں کے لحاظ سے ہو۔ اور اگر پوری عقلمندی کو دخل دیکر امانتداری میں تمام پہلوؤں کا لحاظ نہ ہو تو ایسی دیانت اور امانت کئی طور سے چھپی ہوئی خیانتیں اپنے ہمراہ رکھے گی۔ اور پھر دوسری جگہ فرمایا۔ ولا

تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا
مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ٥ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ
تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ٥ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ
اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ
وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۔ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۔

یعنی آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناجائز طور پر مت کھایا کرو۔ اور نہ اپنے مال کو رشوت کے طور پر حکام تک پہنچایا کرو۔ تا اس طرح پر حکام کی اعانت سے دوسرے کے مالوں کو دبالو۔ امانتوں کو اُن کے حقداروں کو واپس دیدیا کرو۔ خدا خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ جب تم ماپو تو پورا ماپو۔ جب تم وزن کرو۔ تو پوری اور بے خلل ترازو سے وزن کرو۔ اور کسی طور سے لوگوں کو انکے مال کا نقصان نہ پہنچاؤ اور فساد کی نیت سے زمین پر مت پھرا کرو۔ یعنی اس نیت سے کہ چوری کریں یا ڈاکہ ماریں۔ یا کسی کی جیب کتریں۔ یا کسی اور ناجائز طریق سے بیگانہ مال پر قبضہ کریں۔ اور پھر فرمایا کہ تم اچھی چیزوں کے عوض میں خبیث اور ردی چیزیں نہ دیا کرو۔ یعنی جس طرح دوسروں کا مال دبا لینا ناجائز ہے۔ اسی طرح خراب چیزیں بیچنا یا اچھی کے عوض میں بُری دینا بھی ناجائز ہے۔ ان تمام آیات میں خدا تعالےٰ نے تمام طریقے بددیانتی کے بیان فرما دیئے ہیں۔ اور ایسا کلام کلی کے طور پر فرمایا جس میں کسی بددیانتی کا ذکر باہر نہ رہ جائے۔ صرف یہ نہیں کہا۔ کہ تو چوری نہ کر۔ تا ایک نادان یہ نہ سمجھ لے۔ کہ چوری تو میرے لئے حرام ہے۔ مگر دوسرے ناجائز طریقے سب حلال ہیں۔ اس کلمہ حرام جامعہ کے ساتھ تمام ناجائز طریقوں کو حرام ٹھہرانا یہی حکمت بیانی ہے۔ غرض اگر کوئی اس بصیرت سے دیانت اور امانت کا خلق اپنے اندر نہیں رکھتا۔ اور ایسے تمام پہلوؤں کی رعایت نہیں کرتا۔ وہ اگر دیانت و امانت کو بعض امور میں دکھلائے بھی۔ تو یہ حرکت اسکی خلق دیانت میں داخل نہیں سمجھی جائیگی۔ بلکہ ایک طبعی حالت ہوگی۔ جو عقلی تمیز اور بصیرت سے خالی ہے ٭

تیسری قسم صلحکاری

تیسری قسم ترک شر کے اخلاق میں سے وہ قسم ہے کہ جس کو عربی میں ھدنہ اور ھَوْن کہتے ہیں۔ یعنی دوسرے کو ظلم کی راہ سے بدنی آزار نہ پہنچانا۔ اور بے شر انسان ہونا۔ اور صلحکاری کے ساتھ زندگی بسر کرنا۔ پس بلاشبہ صلحکاری اعلیٰ درجہ کا ایک خُلق ہے اور انسانیت کے لئے ازبس ضروری۔ اور اس خلق کے مناسب حال طبعی قوت جو بچہ میں ہوتی ہے۔ جسکی تعدیل سے یہ خلق بنتا ہے۔ اُلفت یعنی خوگرفتگی ہے۔ یہ تو ظاہر ہے۔ کہ انسان صرف اپنی طبعی حالت میں یعنی اس حالت میں کہ جب انسان عقل سے بے بہرہ ہو صلح کے مضمون کو سمجھ نہیں سکتا۔ اور نہ جنگ جوئی کے مفہوم کو سمجھ سکتا ہے۔ پس اسوقت جو ایک عادت موافقت کی اس میں پائی جاتی ہے۔ وہی صلحکاری کی عادت کی جڑھ ہے۔ لیکن چونکہ وہ عقل اور تدبر اور خاص ارادہ سے اختیار نہیں کیجاتی۔ اس لئے خلق میں داخل نہیں۔ بلکہ خلق میں تب داخل ہوگی۔ کہ جب انسان بالارادہ اپنے تئیں بے شر بناکر صلحکاری کے خلق کو اپنے محل پر استعمال کرے۔ اور بے محل استعمال کرنے سے مجتنب رہے۔ اس میں اللہ جلشانہٗ یہ تعلیم فرماتا ہے۔ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِکُمْ۔ اَلصُّلْحُ خَیْرٌ۔ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَھَا۔ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا وَّاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا۔ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ۔ یعنی آپس میں صلحکاری اختیار کرو۔ صلح میں خیر ہے۔ جب وہ صلح کی طرف جھکیں۔ تو تم بھی جھک جاؤ۔ خدا کے نیک بندے صلحکاری کے ساتھ زمین پر چلتے ہیں۔ اور اگر کوئی لغو بات کسی سے سُنیں۔ جو جنگ کا مقدمہ اور لڑائی کی ایک تمہید ہو۔ تو بزرگانہ طور پر طرح دیکر چلے جاتے ہیں۔ اور ادنیٰ بات پر لڑنا شروع نہیں کر دیتے۔ یعنی جب تک کوئی زیادہ تکلیف نہ پہنچے۔ اس وقت تک ہنگامہ پردازی کو اچھا نہیں سمجھتے۔ اور صلحکاری کے محل شناسی کا یہی اصول ہے۔ کہ ادنیٰ ادنیٰ باتوں کو خیال میں نہ لاویں۔ اور معاف فرماویں۔ اور لغو کا لفظ جو اس آیت میں آیا ہے سو واضح

ہو۔کہ عربی زبان میں لغو اس حرکت کو کہتے ہیں۔کہ مثلاً ایک شخص شرارت سے ایسی
بکواس کرے یا بہ نیت ایذا ایسا فعل اس سے صادر ہو۔کہ دراصل اس سے کچھ
ایسا حرج اور نقصان نہیں پہنچتا۔سو صلحکاری کی یہ علامت ہے کہ ایسی بیہودہ
ایذا سے چشم پوشی فرماویں۔اور بزرگانہ سیرت عمل میں لاویں۔لیکن ایذا صرف لغو کی
مد میں داخل نہ ہو۔بلکہ اس سے واقعی طور پر جان یا مال یا عزت کو ضرر پہنچے۔تو صلحکاری
کے خلق کو اس سے کچھ تعلق نہیں۔بلکہ اگر ایسے گناہ کو بخشا جائے تو اس خلق کا نام عفو
ہے۔جس کا انشاء اللہ تعالٰے اس کے بعد بیان ہوگا۔اور پھر فرمایا۔کہ جو شخص شرارت
سے کچھ یاوہ گوئی کرے۔تو تم نیک طریق سے صلحکاری کا اس کو جواب دو۔تب اس
خصلت سے دشمن بھی دوست ہو جائیگا غرض صلحکاری کے طریق سے چشم پوشی کا
محل صرف اس درجہ کی بدی ہے۔جس سے کوئی واقعی نقصان نہ پہنچا ہو۔صرف دشمن
کی بیہودہ گوئی ہو۔**چوتھی قسم ترک شر** کے اخلاق میں سے رفق اور قول حسن ہے اور
یہ خلق جس حالت طبعی سے پیدا ہوتا ہے اس کا نام **طلاقت** یعنی کشادہ روئی ہے
بچہ جب تک کلام کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔بجائے رفق اور قول حسن کے طلاقت
دکھلاتا ہے۔یہی دلیل اس بات پر ہے کہ رفق کی جڑ جہاں سے یہ شاخ پیدا ہوتی
ہے۔طلاقت ہے۔طلاقت ایک قوت ہے۔اور رفق ایک خلق ہے۔جو اس قوت
کو محل پر استعمال کرنے سے پیدا ہو جاتا ہے۔اس میں خدا تعالٰی کی تعلیم یہ ہے۔
قُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا ۝ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسَىٰ أَنْ يَّكُونُوا خَيْرًا
مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّنْ نِّسَاءٍ عَسَىٰ أَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا
أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ
بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ۝ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
إِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيمٌ ۝ وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ ۝ إِنَّ السَّمْعَ
وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ۝ یعنی لوگوں کو وہ باتیں
کہو۔جو واقعی طور پر نیک ہوں۔ایک قوم دوسری قوم سے ٹھٹھا نہ کرے۔ہو سکتا ہے

کہ جن سے ٹھٹھا کیا گیا ہے۔ وہی اچھے ہوں۔ اور عیب مت لگاؤ۔ اپنے لوگوں کے بُرے بُرے نام مت رکھو۔ بدگمانی کی باتیں مت کرو۔ اور نہ عیبوں کو کرید کرید کر پوچھو ایک دوسرے کا گلہ مت کرو۔ کسی کی نسبت وہ بہتان یا الزام مت لگاؤ جس کا تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں اور یاد رکھو۔ کہ ہر ایک عضو سے مواخذہ ہوگا اور کان آنکھ دل ہر ایک سے پوچھا جائے گا +

اب ترکِ شر کے اقسام ختم ہو چکے۔ اور اب ہم ایصال خیر کے اقسام بیان کرتے ہیں۔ دوسری قسم ان اخلاق کی جو ایصالِ خیر سے تعلق رکھتے ہیں۔ پہلا خلق ان میں سے عفو ہے۔ یعنی کسی کے گناہ کو بخش دینا اس میں ایصالِ خیر یہ ہے۔ کہ جو گناہ کرتا ہے۔ وہ ایک ضرر پہنچاتا ہے۔ اور اس لائق ہوتا ہے۔ کہ اس کو بھی ضرر پہنچایا جائے۔ سزا دلائی جائے۔ قید کرایا جائے۔ جرمانہ کرایا جائے۔ یا آپ ہی اس پر ہاتھ اُٹھایا جائے۔ پس اس کو بخش دینا۔ اگر بخش دینا مناسب ہو تو اس کے حق میں ایصالِ خیر ہے۔ اس میں قرآن شریف کی تعلیم یہ ہے۔ وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ جَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفٰى وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ط یعنی نیک آدمی وہ ہیں۔ جو غصہ کھانے کے محل پر گناہ کو بخشتے ہیں۔ بدی کی جزا اسی قدر بدی ہے۔ جو کی گئی ہو۔ لیکن جو شخص گناہ کو بخش دے اور ایسے موقع پر بخشے۔ کہ اس سے کوئی اصلاح ہوتی ہو۔ کوئی شر پیدا نہ ہوتا ہو۔ یعنی عین عفو کے محل پر ہو۔ نہ غیر محل پر۔ تو اس کا وہ بدلہ پائے گا۔ اس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآنی تعلیم یہ نہیں۔ کہ خواہ نخواہ اور ہر جگہ شر کا مقابلہ نہ کیا جائے اور شریروں اور ظالموں کو سزا نہ دی جائے۔ بلکہ یہ تعلیم ہے کہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ محل اور موقعہ گناہ بخشنے کا ہے۔ یا سزا دینے کا ہے۔ پس مجرم کے حق میں اور نیز عامہ خلائق کے حق میں جو کچھ فی الواقع بہتر ہو۔ وہی صورت اختیار کی جائے۔ بعض وقت ایک مجرم گناہ بخشنے سے اور بھی دلیر ہو جاتا ہے۔ پس خدا تعالےٰ فرماتا ہے۔ کہ اندھوں کی طرح صرف گناہ بخشنے کی عادت مت ڈالو۔ بلکہ غور سے دیکھ لیا کرو۔ کہ

حقیقی نیکی کس بات میں ہے۔ آیا بخشنے میں یا سزا دینے میں پس جو امر محل اور موقع کے مناسب ہو وہی کرو۔ افراد انسانی کے دیکھنے سے صاف ظاہر ہے کہ جیسے بعض لوگ کینہ کشی پر بہت حریص ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ دادوں پردادوں کے کینوں کو یاد رکھتے ہیں۔ ایسا ہی بعض لوگ عفو اور درگذر کی عادت کو انتہا تک پہنچا دیتے ہیں اور بسا اوقات اس عادت کے افراط سے دیّوثی تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور ایسے قابل شرم حلم اور عفو اور درگذران سے صادر ہوتے ہیں جو سراسر حمیت اور غیرت اور عفت کے برخلاف ہوتے ہیں بلکہ نیک چلنی پر داغ لگاتے ہیں۔ اور ایسے عفو اور درگذر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب لوگ توبہ توبہ کر اٹھتے ہیں۔ انہی خرابیوں کے لحاظ سے قرآن شریف میں ہر ایک خلق کے لئے محل اور موقع کی شرط لگا دی ہے۔ اور ایسے خلق کو منظور نہیں رکھا جو بے محل صادر ہو۔ یاد رہے۔ کہ مجرّد عفو کو خلق نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ ایک طبعی قوت ہے۔ جو بچّوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ بچّہ کو جسکے ہاتھ سے چوٹ لگ جائے خواہ شرارت سے ہی لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس قصہ کو بھلا دیتا ہے۔ اور پھر اس کے پاس محبت سے جاتا ہے۔ اور اگر ایسے شخص نے اس کے قتل کا بھی ارادہ کیا ہو۔ تب بھی صرف میٹھی بات پر خوش ہو جاتا ہے۔ پس ایسا عفو کسی طرح خلق میں داخل نہیں ہوگا۔ خلق میں اس صورت میں داخل ہوگا۔ جب ہم اس کو محل اور موقع پر استعمال کرینگے۔ ورنہ صرف ایک طبعی قوت ہوگی۔ دُنیا میں بہت تھوڑے ایسے لوگ ہیں۔ جو طبعی قوت اور خلق میں فرق کر سکتے ہوں ہم بار بار لکھ چکے ہیں۔ کہ حقیقی خلق اور طبعی حالتوں میں یہ فرق ہے۔ کہ خلق ہمیشہ محل اور موقعہ کی پابندی اپنے ساتھ رکھتا ہے اور طبعی قوت بے محل بھی ظاہر ہو جاتی ہے۔ یُوں تو چارپایوں میں گائے بھی بے شر ہے۔ اور بکری بھی دل کی غریب ہے۔ مگر ہم ان کو اسی سبب سے ان خلقوں سے متصف نہیں کہہ سکتے کہ ان کو محل اور موقعہ کی عقل نہیں دیگئی۔ خدا کی حکمت اور خدا کی سچی اور کامل کتاب نے ہر ایک خلق کے ساتھ محل اور موقعہ کی شرط لگا دی ہے۔

دوسرا خلق اخلاق ایصال خیر میں سے عدل ہے۔ اور تیسرا احسان
اور چوتھا ایتاء ذی القربیٰ۔ جیسا کہ اللہ جلشانہ فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ
بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ
وَالْبَغْیِ یعنی اللہ تعالےٰ کا یہ حکم ہے کہ نیکی کے مقابل پر نیکی کرو۔ اور اگر عدل
سے بڑھ کر احسان کا موقع اور محل ہو۔ تو وہاں احسان کرو۔ اور اگر احسان سے
بڑھ کر قریبیوں کی طرح طبعی جوش سے نیکی کرنے کا محل ہو۔ تو وہاں طبعی ہمدردی سے
نیکی کرو۔ اور اس سے خدا تعالیٰ منع فرماتا ہے۔ کہ تم حدود اعتدال سے آگے
گذر جاؤ۔ یا احسان کے بارے میں منکرانہ حالت تم سے صادر ہو۔ جس سے عقل انکار
کرے یعنی یہ کہ تم بے محل احسان کرو۔ یا بر محل احسان کرنے سے دریغ کرو۔ یا یہ کہ
تم محل پر ایتاء ذی القربیٰ کے خلق میں کچھ کمی اختیار کرو۔ یا حد سے زیادہ رحم کی
بارش کرو۔ اس آیت کریمہ میں ایصال خیر کے تین درجوں کا بیان ہے۔ اول یہ درجہ
کہ نیکی کے مقابل پر نیکی کی جاوے۔ یہ تو کم درجہ ہے اور ادنے درجہ کا بھلامانس
آدمی بھی یہ خلق حاصل کر سکتا ہے کہ اپنے نیکی کرنے والوں کے ساتھ نیکی کرتا
رہے۔ دوسرا درجہ اس سے مشکل ہے۔ اور وہ یہ کہ ابتداءً آپ ہی نیکی کرنا۔ اور بغیر کسی کے حق
کے احسان کے طور پر اس کو فائدہ پہنچانا۔ اور یہ خلق اوسط درجہ کا ہے۔ اکثر لوگ
غریبوں پر احسان کرتے ہیں۔ اور احسان میں یہ ایک عیب مخفی ہے۔ کہ احسان
کرنے والا خیال کرتا ہے۔ کہ میں نے احسان کیا ہے۔ اور کم سے کم وہ اپنے احسان
کے عوض میں شکریہ یا دعا چاہتا ہے اور اگر کوئی ممنونِ منت اسکے مخالف ہو جاتا ہے
تو اس کا نام احسان فراموش رکھتا ہے۔ بعض وقت اپنے احسان کی وجہ سے
اسپر فوق الطاقت بوجھ ڈالتا ہے۔ اور اپنا احسان اس کو یاد دلاتا ہے۔ جیسا
کہ احسان کرنیوالوں کو خدا تعالیٰ متنبہ کرنیکے لئے فرماتا ہے لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِکُمْ
بِالْمَنِّ وَالْاَذٰی۔ یعنی اے احسان کرنے والو! اپنے صدقات کو جنکی صدق
پر بنا چاہیئے۔ احسان یاد دلانے اور دکھ دینے کے ساتھ برباد مت کرو۔ یعنی

صدقہ کا لفظ صدق سے مشتق ہے۔ پس اگر دل میں صدق اور اخلاص نہ رہے۔ تو وہ صدقہ صدقہ نہیں رہتا ہے۔ بلکہ ایک ریاکاری کی حرکت ہو جاتی ہے۔ غرض احسان کرنیوالے میں یہ ایک خامی ہوتی ہے کہ کبھی غصہ میں آکر اپنا احسان یاد بھی دلا دیتا ہے۔ اسی وجہ سے خدا تعالےٰ نے احسان کرنیوالوں کو ڈرایا۔ تیسرا درجہ ایصال خیر کا خدا تعالےٰ نے یہ فرمایا ہے کہ بالکل احسان کا خیال نہ ہو۔ اور نہ شکر گذاری پر نظر ہو۔ بلکہ ایک ایسے ہمدردی کے جوش سے نیکی صادر ہو جیسا کہ ایک نہایت قریبی مثلاً والدہ محض ہمدردی کے جوش سے اپنے بیٹے سے نیکی کرتی ہے۔ یہ وہ آخری درجہ ایصال خیر کا ہے۔ جس سے آگے ترقی کرنا ممکن نہیں لیکن خدا تعالےٰ نے ان تمام ایصال خیر کی قسموں کو محل اور موقعہ سے وابستہ کر دیا ہے۔ اور آیت موصوفہ میں صاف فرما دیا ہے کہ اگر یہ نیکیاں اپنے اپنے محل پر مستعمل نہیں ہونگی۔ تو پھر یہ بدیاں ہو جائینگی۔ بجائے عدل فحشاء بن جائیگا۔ یعنی حد سے اتنا تجاوز کرنا کہ ناپاک صورت ہو جائے۔ اور ایسا ہی بجائے احسان کے منکر کی صورت نکل آئیگی۔ یعنی وہ صورت جس سے عقل اور کانشنس انکار کرتا ہے اور بجائے ایتاءِ ذی القربیٰ کے بغی بنجائیگا۔ یعنی وہ بے محل ہمدردی کا جوش ایک بُری صورت پیدا کریگا۔ اصل میں بغی اس بارش کو کہتے ہیں۔ جو حد سے زیادہ برس جائے۔ اور کھیتوں کو تباہ کردے اور یا حق واجب سے افزونی کرنا بھی بغی ہے۔ غرض ان تینوں میں سے جو محل پر صادر نہیں ہوگا۔ وہی خراب سیرت ہو جائیگی۔ اسی لئے ان تینوں کے ساتھ موقع اور محل کی شرط لگا دی ہے۔ اس جگہ یاد رہے۔ کہ مجرد عدل یا احسان یا ہمدردی ذوالقربےٰ کو خلق نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ انسان میں یہ سب طبعی حالتیں اور طبعی قوتیں ہیں۔ کہ جو بچوں میں بھی وجودِ عقل سے پہلے پائی جاتی ہیں۔ مگر خلق کے لئے عقل شرط ہے۔ اور نیز یہ شرط ہے۔ کہ ہر ایک طبعی قوت محل اور موقع پر استعمال ہو ÷

اور پھر احسان کے بارے میں اور بھی ضروری ہدایتیں قرآن شریف میں ہیں

اور سب کو الف لام کے ساتھ جو خاص کرنے کے لئے آتا ہے۔ استعمال فرما کر موقع اور محل
کی رعایت کی طرف اشارہ فرمایا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ یا ایہا الذین
آمنوا انفقوا من طیبات ما کسبتم ولا تیمموا الخبیث منہ
لا تبطلوا صدقتکم بالمن والاذی کالذی ینفق مالہ رئاء
الناس۔ احسنوا ان اللہ یحب المحسنین ٥ ان الابرار یشربون
من کاس کان مزاجہا کافورا ٥ عینا یشرب بہا عباد اللہ یفجرونہا
تفجیرا ٥ ویطعمون الطعام علی حبہ مسکینا ویتیما واسیرا ٥ انما
نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاء ولا شکورا ٥ واتی المال علی
حبہ ذوی القربی والیتمی والمسکین وابن السبیل والسائلین و
فی الرقاب ٥ اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذلک
قواما۔ والذین یصلون ما امر اللہ بہ ان یوصل ویخشون ربہم
ویخافون سوء الحساب ط وفی اموالہم حق للسائل والمحروم
الذین ینفقون فی السراء والضراء وانفقوا مما رزقنہم سرا
وعلانیۃ ٥ انما الصدقات للفقراء والمساکین والعاملین علیہا
والمؤلفۃ قلوبہم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل اللہ وابن
السبیل فریضۃ من اللہ واللہ علیم حکیم ٥ لن تنالوا البر حتی
تنفقوا مما تحبون ٥ وات ذا القربی حقہ والمسکین وابن السبیل
ولا تبذر تبذیرا ٥ وبالوالدین احسانا وبذی القربی والیتمی
والمساکین والجار ذی القربی والجار الجنب والصاحب بالجنب
وابن السبیل وما ملکت ایمانکم ان اللہ لا یحب من کان مختالا
فخورا الذین یبخلون ویامرون الناس بالبخل ویکتمون ما اتہم
اللہ من فضلہ۔ ترجمہ یہ ہے کہ اے ایمان والو۔ تم ان مالوں میں سے لوگوں کو
بطریق سخاوت یا احسان یا صدقہ وغیرہ دو جو تمہاری پاک کمائی ہے یعنی جس میں چوری

یا رشوت یا خیانت یا غبن کا مال یا ظلم کے روپیہ کی آمیزش نہیں۔ اور یہ قصد تمہارے دل سے دُور رہے۔ کہ ناپاک مال لوگوں کو دو اور دوسری یہ بات ہے کہ اپنی خیرات اور مروت کو احسان رکھنے اور دُکھ دینے کے ساتھ باطل مت کرو یعنی اپنے ممنونِ منت کو کبھی یہ نہ جتلاؤ۔ کہ ہم نے تجھے یہ دیا تھا اور نہ اس کو دُکھ دو۔ کہ اس طرح تمہارا احسان باطل ہوگا۔ اور نہ ایسا طریق پکڑو۔ کہ تم اپنے مالوں کو ریاکاری کے ساتھ خرچ کرو۔ خدا کی مخلوق سے احسان کرو۔ کہ خدا احسان کرنیوالوں کو دوست رکھتا ہے۔ جو لوگ حقیقی نیکی کرنیوالے ہیں۔ اُنکو وہ جام پلائے جائینگے۔ جنکی ملونی کافور کی ہوگی۔ یعنی دُنیا کی سوزشیں اور حسرتیں اور ناپاک خواہشیں ان کے دل سے دُور کر دی جائینگی۔ کافور کفر سے مشتق ہے اور کفر لغت عرب میں دبانے اور ڈھانکنے کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ ان کے ناجائز جذبات دبائے جائینگے اور وہ پاک باطن ہو جائینگے۔ اور معرفت کی خنکی انکو پہنچے گی۔ پھر فرماتا ہے کہ وہ لوگ قیامت کو اس سرچشمہ کا پانی پئیں گے جسکو وہ آج اپنے ہاتھ سے چیر رہے ہیں۔ اسجگہ بہشت کی فلاسفی کا ایک گہرا راز بتلایا ہے جسکو سمجھنا ہو سمجھ لے اور پھر فرمایا ہے کہ حقیقی نیکی کرنے والوں کی یہ خصلت ہے کہ وہ محض خدا کی محبت کے لئے وہ کھانے جو آپ پسند کرتے ہیں مسکینوں اور یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں۔ کہ ہم تم پر کوئی احسان نہیں کرتے بلکہ یہ کام صرف اس بات کے لئے کرتے ہیں۔ کہ خدا ہم سے راضی ہو۔ اور اس کے مُنہ کے لئے یہ خدمت ہے ہم تم سے نہ تو کوئی بدلہ چاہتے ہیں۔ اور نہ یہ چاہتے ہیں۔ کہ تم ہمارا شکر کرتے پھرو۔ یہ اشارہ اس بات کیطرف ہے کہ ایصال خیر کی تیسری قسم جو محض ہمدردی کے جوش سے ہے۔ وہ طریق بجا لاتے ہیں۔

[illegible]

سچے نیکوں کی یہ عادت ہوتی ہے۔ کہ خدا کی رضا جوئی کے لئے اپنے قریبیوں کی اپنے مال سے مدد کرتے ہیں۔ اور نیز اس مال میں سے یتیموں کے تعہد اور ان کی پرورش اور تعلیم وغیرہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں۔ اور مسکینوں کو فقر و فاقہ سے بچاتے ہیں۔ اور مسافروں اور سوالیوں کی خدمت کرتے ہیں۔ اور ان

طبعی ہمدردی کے جوش سے نیکی

مالوں کو غلاموں کو آزاد کرانے کے لئے اور قرضداروں کو سبکدوش کرنے کے لئے بھی دیتے ہیں۔ اور اپنے خرچوں میں نہ تو اسراف کرتے ہیں۔ نہ تنگدلی کی عادت رکھتے ہیں۔ اور میانہ روش چلتے ہیں۔ پیوند کرنے کی جگہ پر پیوند کرتے ہیں۔ اور خدا سے ڈرتے ہیں۔ اور ان کے مالوں میں سوالیوں اور بے زبانوں کا حق بھی ہے بے زبانوں سے مراد کتے بلیاں۔ چڑیاں۔ بیل۔ گدھے۔ بکریاں اور دوسری چیزیں ہیں۔ وہ تکلیفوں اور کم آمدنی کی حالت میں اور قحط کے دنوں میں سخاوت سے دل تنگ نہیں ہو جاتے۔ بلکہ تنگی کی حالت میں بھی اپنے مقدور کے موافق سخاوت کرتے رہتے ہیں۔ وہ کبھی پوشیدہ خیرات کرتے رہتے ہیں اور کبھی ظاہر۔ پوشیدہ اس لئے کہ تا ریاکاری سے بچیں۔ اور ظاہر اس لئے کہ تا دوسروں کو ترغیب دیا خیرات اور صدقات وغیرہ پر جو مال دیا جائے۔ اس میں یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ پہلے جس قدر محتاج ہیں۔ اُنکو دیا جائے۔ ہاں جو خیرات کے مال کا تعہد کریں۔ یا اُس کے لئے انتظام و اہتمام کریں انکو بھی خیرات کے مال سے کچھ طرح ہو سکتا ہے اور نیز کسی کو بدی سے بچانے کے لئے بھی اس مال میں سے دے سکتے ہیں۔ ایسا ہی وہ مال غلاموں کے آزاد کرنے کے لئے اور محتاج اور قرضہ داروں اور آفت زدہ لوگوں کی مدد کے لئے بھی۔ اور دوسری راہوں میں جو محض خدا کے لئے ہوں وہ مال خرچ ہوگا۔ تم حقیقی نیکی کو ہرگز نہیں پا سکتے۔ جب تک کہ بنی نوع کی ہمدردی میں وہ مال خرچ نہ کرو۔ جو تمہارا پیارا مال ہے۔ غریبوں کا حق ادا کرو۔ مسکینوں کو دو۔ مسافروں کی خدمت کرو۔ اور فضولیوں سے اپنے تئیں بچاؤ۔ یعنی بیاہوں شادیوں میں اور طرح طرح کی عیاشی کی جگہوں میں۔ اور لڑکا پیدا ہونے وغیرہ رسوم میں جو اسراف سے مال خرچ کیا جاتا ہے۔ اس سے اپنے تئیں بچاؤ۔ تم ماں باپ سے نیکی کرو۔ اور قریبوں سے اور یتیموں سے اور مسکینوں سے اور ہمسایہ سے جو تمہارا قریبی ہے اور ہمسایہ سے جو بیگانہ ہے۔ اور مسافر سے اور نوکر اور غلام اور گھوڑے اور بکری اور بیل اور گائے سے اور حیوانات سے جو تمہارے قبضہ میں ہوں۔ کیونکہ

خدا کہ جو تمہارا خدا ہے۔ یہی عادتیں پسند ہیں۔ وہ لاپروا ہوں اور خود غرضوں سے محبت نہیں رکھتا۔ اور ایسے لوگوں کو نہیں چاہتا جو بخیل ہیں اور لوگوں کو بخل کی تعلیم دیتے ہیں اور اپنے مال کو چھپاتے ہیں یعنی محتاجوں کو کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کچھ نہیں۔

شجاعت

اور منجملہ انسان کی طبعی حالتوں کے وہ حالت ہے جو شجاعت سے مشابہت ہوتی ہے۔ جیسا کہ شیر خوار بچہ بھی اسی قوت کی وجہ سے کبھی آگ میں ہاتھ ڈالنے لگتا ہے۔ کیونکہ انسان کا بچہ بباعث فطرتی جوہر غلبہ انسانیت کے ڈرانے والے نمونوں سے پہلے کسی چیز سے بھی نہیں ڈرتا۔ اس حالت میں انسان نہایت بے باکی سے شیروں اور دوسرے جنگلی درندوں کا بھی مقابلہ کرتا ہے۔ اور تن تنہا مقابلہ کے لئے کئی آدمیوں سے لڑنے کے لئے نکلتا ہے اور لوگ جانتے ہیں کہ بڑا بہادر ہے لیکن یہ صرف ایک طبعی حالت ہے۔ جس طرح اور درندوں میں بھی پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ کتوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ اور حقیقی شجاعت جو محل اور موقع کے ساتھ خاص ہے اور جو اخلاق فاضلہ میں سے ایک خلق ہے وہ ان محل اور موقع کے امور کا نام ہے۔ جن کا ذکر خدا تعالیٰ کے پاک کلام میں اس طرح پر آیا ہے وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَاۗءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَاۗءَ النَّاسِ۔ یعنی بہادر وہ ہیں۔ کہ جب لڑائی کا موقع آ پڑے۔ یا اُن پر کوئی مصیبت آ پڑے تو بھاگتے نہیں۔ اُن کا صبر لڑائی اور سختیوں کے وقت میں خدا کی رضامندی کے لئے ہوتا ہے۔ اور اس کے چہرے کے طالب ہوتے ہیں نہ کہ بہادری دکھلانے کے۔ انکو ڈرایا جاتا ہے۔ کہ لوگ تمہیں سزا دینے کے لئے اتفاق کر گئے ہیں۔ سو تم لوگوں سے ڈرو۔ پس ڈرانے سے اور بھی اُن کا ایمان بڑھتا ہے اور کہتے ہیں۔ کہ خدا ہمیں کافی ہے۔ یعنی ان کی شجاعت کتوں اور درندوں کی طرح نہیں ہوتی۔ جو صرف طبعی جوش پر مبنی ہو جس کا ایک ہی پہلو پر میل ہو۔ بلکہ

انکی شجاعت دو پہلو رکھتی ہے۔کبھی تو وہ اپنی ذاتی شجاعت سے اپنے نفس کے جذبات کا مقابلہ کرتے ہیں۔اور اس پر غالب آتے ہیں اور کبھی جب دیکھتے ہیں۔کہ دشمن کا مقابلہ قرینِ مصلحت ہے۔تو نہ صرف جوش نفس سے بلکہ سچائی کی مدد کے لئے دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں۔مگر نہ اپنے نفس پر بھروسہ کرکے بلکہ خدا پر بھروسہ کرکے بہادری دکھاتے ہیں۔اور انکی شجاعت میں کوئی ریاکاری اور خود بینی نہیں ہوتی۔اور نہ نفس کی پیروی بلکہ ہر ایک پہلو سے خدا کی رضا مقدم ہوتی ہے۔ان آیات میں یہ سمجھایا گیا ہے۔کہ حقیقی شجاعت کی جڑھ صبر اور ثابت قدمی ہے۔اور ہر ایک جذبۂ نفسانی یا بلاجو دشمنوں کی طرح حملہ کرے۔اس کے مقابلہ پر ثابت قدم رہنا۔اور بزدل ہوکر بھاگ نہ جانا یہی شجاعت ہے سو انسانی شجاعت اور درندہ کی شجاعت میں بڑا فرق ہے۔درندہ ایک ہی پہلو پر جوش اور غضب سے کام لیتا ہے۔اور انسان جو حقیقی شجاعت رکھتا ہے۔وہ مقابلہ اور ترک مقابلہ میں جو کچھ قرینِ مصلحت ہو۔وہ اختیار کر لیتا ہے۔

سچائی

اور منجملہ انسان کی طبعی حالتوں کے جو اس کی فطرت کا خاصہ ہے سچائی ہے انسان جب تک کوئی غرض نفسانی اس کی محرک نہ ہو۔جھوٹ بولنا نہیں چاہتا اور جھوٹ کے اختیار کرنے میں ایک طرح کی نفرت اور قبض اپنے دل میں پاتا ہے اسی وجہ سے جس شخص کا صریح جھوٹ ثابت ہو جائے۔اس سے ناخوش ہوتا ہے اور اس کو تحقیر کی نظر سے دیکھتا ہے لیکن صرف یہی طبعی حالت اخلاق میں داخل نہیں ہو سکتی۔بلکہ بچے اور دیوانے بھی اسکے پابند رہ سکتے ہیں۔سو اصل حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان ان نفسانی اغراض سے علیحدہ نہ ہو۔جو راستگوئی سے روک دیتے ہیں۔تب تک حقیقی طور پر راستگو نہیں ٹھہر سکتا۔کیونکہ اگر انسان صرف ایسی باتوں میں سچ بولے جس میں اس کا چنداں ہرج نہیں اور اپنی عزت یا مال یا جان کے نقصان کے وقت جھوٹ بول جائے۔اور سچ بولنے سے خاموش رہے۔تو اس کو دیوانوں اور بچوں پر کیا فوقیت ہے۔کیا پاگل اور نابالغ لڑکے

کبھی ایسا سچ نہیں بولتے۔ دنیا میں ایسا کوئی بھی نہیں ہوگا۔ جو بغیر کسی تحریک کے خواہ مخواہ جھوٹ بولے۔ بس ایسا سچ جو کسی نقصان کے وقت چھوڑا جائے حقیقی اخلاق میں ہرگز داخل نہیں ہوگا۔ سچ کے بولنے کا بڑا بھاری محل اور موقع وہی ہے جس میں اپنی جان یا مال یا آبرو کا اندیشہ ہو۔ اس میں خدا کی یہ تعلیم ہے۔

جھوٹ سے ممانعت

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ۔ فَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى كُوْنُوْا قَوّٰامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ۔ ترجمہ بتوں کی پرستش اور جھوٹ بولنے سے پرہیز کرو۔ یعنی جھوٹ بھی ایک بت ہے جس پر بھروسہ کرنے والا خدا کا بھروسہ چھوڑ دیتا ہے۔ سو جھوٹ بولنے سے خدا بھی ہاتھ سے جاتا ہے اور پھر فرمایا کہ جب تم سچی گواہی کیلئے بلائے جاؤ۔ تو جانے سے انکار مت کرو۔ اور سچی گواہی کو مت چھپاؤ۔ اور جو چھپائیگا۔ اس کا دل گنہگار ہے۔ اور جب تم بولو۔ تو وہی بات منہ پر لاؤ۔ جو سراسر سچ اور عدالت کی بات ہے۔ اگرچہ تم اپنے کسی قریبی پر گواہی دو۔ حق اور انصاف پر قائم ہو جاؤ۔ اور چاہیے کہ ہر ایک گواہی تمہاری خدا کے لئے ہو جھوٹ مت بولو۔ اگرچہ سچ بولنے سے تمہاری جانوں کو نقصان پہنچے۔ یا اس سے تمہارے ماں باپ کو ضرر پہنچے۔ اور قریبیوں کو جیسے بیٹے وغیرہ کو اور چاہیے۔ کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں سچی گواہی سے نہ روکے۔ سچے مرد اور سچی عورتیں بڑے بڑے اجر پائینگے۔ ان کی عادت ہے کہ اوروں کو بھی سچ کی نصیحت دیتے ہیں اور جھوٹوں کی مجلسوں میں نہیں بیٹھتے

صبر

منجملہ انسان کے طبعی امور کے ایک صبر ہے۔ جو اس کو ان مصیبتوں اور بیماریوں اور دکھوں پر کرنا پڑتا ہے۔ جو اس پر ہمیشہ پڑتے رہتے ہیں اور انسان بہت سے سیاپے اور جزع فزع کے بعد صبر اختیار کرتا ہے۔ لیکن جاننا چاہیے کہ خدا تعالےٰ

کی پاک کتاب کے رو سے وہ صبر اخلاق میں داخل نہیں ہے۔ بلکہ وہ حالت ہے۔ جو تھک جانے کے بعد ضرورتاً ظاہر ہو جاتی ہے۔ یعنی انسان کی طبعی حالتوں میں سے یہ بھی ایک حالت ہے۔ کہ وہ مصیبت کے ظاہر ہونے کے وقت پہلے روتا چیختا سر پیٹتا ہے۔ آخر بہت سا بخار نکال کر جوش تھم جاتا ہے۔ اور انتہا تک پہنچ کر پیچھے ہٹنا پڑتا ہے۔ پس یہ دونوں حرکتیں طبعی حالتیں ہیں۔ انکو خلق سے کچھ تعلق نہیں۔ بلکہ اس کے متعلق خلق یہ ہے کہ جب کوئی چیز اپنے ہاتھ سے جاتی رہے اور اس چیز کو خدا تعالیٰ کی امانت سمجھ کر کوئی شکایت منہ پر نہ لاوے اور یہ کہے کہ خدا کا تھا خدا نے لے لیا۔ اور ہم اسکی رضا کے ساتھ راضی ہیں۔ اس خلق کے متعلق خدا تعالےٰ کا پاک کلام قرآن شریف ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ۔ یعنی اے مومنو! ہم تمہیں اس طرح پر آزماتے رہیں گے۔ کہ کبھی کوئی خوفناک حالت تم پر طاری ہوگی۔ اور کبھی فقر و فاقہ تمہارے شاملِ حال ہوگا۔ اور کبھی تمہارا مالی نقصان ہوگا۔ اور کبھی جانوں پر آفت آئے گی۔ اور کبھی اپنی محنتوں میں ناکام رہو گے۔ اور حسب المراد نتیجے کوششوں کے نہیں نکلینگے۔ اور کبھی تمہاری پیاری اولاد مرے گی۔ پس ان لوگوں کو خوشخبری ہو۔ کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچے تو وہ کہتے ہیں۔ کہ ہم خدا کی چیزیں اور اس کی امانتیں اور اس کے مملوک ہیں۔ پس حق یہی ہے کہ جس کی امانت ہے اس کی طرف رجوع کرے۔ یہی لوگ ہیں۔ جن پر خدا کی رحمتیں ہیں۔ اور یہی لوگ ہیں۔ جن پر خدا کی رحمتیں ہیں۔ اور یہی لوگ ہیں جو خدا کی راہ کو پا گئے۔ غرض اس خلق کا نام صبر اور رضا برضائے الٰہی ہے۔ اور ایک طور سے اس خلق کا نام عدل بھی ہے۔ کیونکہ جب کہ خدا تعالیٰ انسان کی تمام زندگی میں اس کی مرضی کے موافق کام کرتا ہے اور نیز ہزارہا باتیں اس کی مرضی کے موافق

ظہور میں لاتا ہے۔ اور انسان کی خواہش کے مطابق اس قدر نعمتیں اس کو دے رکھی ہیں کہ انسان شمار نہیں کر سکتا۔ تو پھر یہ شرط انصاف نہیں۔ کہ اگر وہ کبھی اپنی مرضی بھی منوانا چاہے۔ تو انسان منحرف ہو۔ اور اس کی رضا کے ساتھ راضی نہ ہو۔ اور چون و چرا کرے۔ یا بے دین اور بے راہ ہو جاوے ٭

ہمدردی خلق ازانجملہ انسان کے طبعی امور کے جو اس کی طبیعت کے لازم حال ہیں۔ ہمدردی خلق کا ایک جوش ہے۔ قومی حمایت کا جوش بالطبع ہر ایک مذہب کے لوگوں میں پایا جاتا ہے۔ اور اکثر لوگ طبعی جوش سے اپنی قوم کی ہمدردی کے لئے دوسروں پر ظلم کر دیتے ہیں۔ گویا انہیں انسان نہیں سمجھتے۔ سو اس حالت کو خلق نہیں کہہ سکتے۔ یہ فقط ایک طبعی جوش ہے۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو یہ حالت طبعی کوؤں وغیرہ پرندوں میں بھی پائی جاتی ہے کہ ایک کوے کے مرنے پر ہزار ہا کوے جمع ہو جاتے ہیں لیکن یہ عادت انسانی اخلاق میں اس وقت داخل ہوگی۔ جبکہ ہمدردی انصاف اور عدل کی رعایت سے محل اور موقع پر ہو اس وقت یہ ایک عظیم الشان خلق ہوگا۔ جس کا نام عربی میں مواسات اور فارسی میں ہمدردی ہے۔ اسی کی طرف اللہ جلشانہ قرآن شریف میں اشارہ فرماتا ہے۔ تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَآءِ الْقَوْمِ وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا ۝ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا ۝ یعنی اپنی قوم کی ہمدردی اور اعانت فقط نیکی کے کاموں میں کرنی چاہیئے اور ظلم اور زیادتی کے کاموں میں ان کی اعانت ہرگز نہیں کرنی چاہیئے۔ اور قوم کی ہمدردی میں سرگرم رہو سست مت ہو اور خیانت کرنے والوں کی طرف سے مت جھگڑو جو خیانت کرنے سے باز نہیں آتے۔ خدا تعالےٰ خیانت پیشہ لوگوں کو دوست نہیں رکھتا ٭

برتر ہستی کی تلاش منجملہ انسان کی طبعی حالتوں کے جو اس کی فطرت کو لازم پڑی

ہوئی ہیں۔ ایک اس برتر ہستی کی تلاش ہے۔ جس کے لئے اندر ہی اندر انسان
کے دل میں ایک کشش موجود ہے۔ اور اس تلاش کا اثر اسی وقت سے محسوس
ہونے لگتا ہے جبکہ بچّہ ماں کے رحم سے باہر آتا ہے۔ کیونکہ بچّہ پیدا ہوتے ہی
پہلے رُوحانی خاصیت اپنی جو دکھاتا ہے۔ وہ یہی ہے۔ کہ ماں کیطرف جھکا جاتا
ہے۔ اور طبعًا اپنی ماں کی محبّت رکھتا ہے۔ اور پھر جیسے جیسے حواس اس کے
کھلتے جاتے ہیں۔ اور شگوفہ فطرت اس کا کھلتا جاتا ہے۔ یہ کشش محبت جو اس کے
اندر چھپی ہوئی تھی۔ اپنا رنگ و رُوپ نمایاں طور پر دکھاتی چلی جاتی ہے۔ پھر تو یہ ہوتا
ہے کہ بچہ اپنی ماں کی گود کے کسی جگہ آرام نہیں پاتا۔ اور پورا آرام اُس کا اسی کے
کنارِ عاطفت میں ہوتا ہے۔ اور اگر ماں سے علیحدہ کر دیا جائے۔ اور دُور ڈال
دیا جائے۔ تب بھی وہ اپنی سچی خوشحالی ماں کی گود میں ہی دیکھتا ہے۔ اور اس کے
بغیر کسی طرح آرام نہیں پاتا۔ سو وہ کشش محبّت جو اس کو اپنی ماں کی طرف پیدا
ہوتی ہے۔ وہ کیا چیز ہے؟

درحقیقت یہ وہی کشش ہے جو معبود حقیقی کے لئے بچّہ کی فطرت میں رکھی
گئی ہے۔ بلکہ ہر ایک جگہ جو انسان تعلق محبت پیدا کرتا ہے۔ درحقیقت وہی
کشش کام کر رہی ہے۔ اور ہر ایک جگہ جو یہ عاشقانہ جوش دکھلاتا ہے درحقیقت
اسی محبت کا وہ ایک عکس ہے۔ گویا دوسری چیزوں کو اُٹھا اُٹھا کر ایک گمشدہ
چیز کو تلاش کر رہا ہے جس کا اب نام بھول گیا ہے۔ سو انسان کا مال یا اولاد
یا بیوی سے محبت کرنا یا کسی خوش آواز کے گیت کی طرف اس کی رُوح کا کھینچے
جانا درحقیقت اسی **گمشدہ محبوب** کی تلاش ہے۔ اور چونکہ انسان اس
دقیق در دقیق ہستی کو جو آگ کی طرح ہر ایک میں مخفی اور سب پر پوشیدہ ہے
اپنی جسمانی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتا۔ اور نہ اپنی ناتمام عقل سے اس کو پا سکتا
ہے۔ اس لئے اس کی معرفت کے بارے میں انسان کو بڑی بڑی غلطیاں لگی ہیں۔ اور
سہو کاریوں سے اس کا حق دوسرے کو دیا گیا ہے۔ خدا نے قرآن شریف میں یہ مثال

قرآن شریف میں ایک لطیف مثال سے مشرک کا رد

خوب وہی ہے۔ کہ دنیا ایک ایسے شیش محل کی طرح ہے جس کی زمین کا فرش نہایت
مصفّا شیشوں سے کیا گیا ہے۔ اور پھر ان شیشوں کے نیچے پانی چھوڑا
گیا ہے۔ جو نہائت تیزی سے چل رہا ہے۔ اب ہر ایک نظر جو شیشوں
پر پڑتی ہے۔ وہ اپنی غلطی سے ان شیشوں کو بھی پانی سمجھ لیتی ہے۔ اور
پھر انسان شیشوں پر چلنے سے ایسا ڈرتا ہے۔ جیساکہ پانی سے ڈرنا چاہئے
حالانکہ درحقیقت شیشے ہیں۔ مگر صاف اور شفاف۔ سو یہ بڑے بڑے
اجرام جو نظر آتے ہیں۔ جیسے آفتاب ماہتاب وغیرہ وہی صاف شیشے ہیں
جنکی غلطی سے پرستش کی گئی۔ اور ان کے نیچے ایک اعلیٰ طاقت کام کر رہی ہے
جو ان شیشوں کے پردہ میں پانی کی طرح بڑی تیزی سے چل رہی ہے۔ اور مخلوق
پرستوں کی نظر کی یہ غلطی ہے۔ کہ انہی شیشوں کیطرف کام کو منسوب کر رہے
ہیں۔ جو ان کے نیچے طاقت دکھلا رہی ہے۔ یہی تفسیر اس آیت کریمہ کی ہے۔
اِنَّہٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْرَ۔ غرض چونکہ خدا تعالےٰ کی ذات باوجود نہایت
روشن ہونے کے پھر بھی نہایت مخفی ہوتی ہے۔ اس لئے اسکی شناخت کے لئے
صرف یہ نظام جسمانی جو ہماری نظروں کے سامنے ہے کافی نہ تھا۔ اور یہی وجہ ہے
کہ ایسے نظام پر مدار رکھنے والے باوجودیکہ اس ترتیب ابلغ اور محکم کو جو عمدہ عمدہ
عجائبات پر مشتمل ہے۔ نہایت غور کی نظر سے دیکھتے رہے بلکہ ہیئت اور طبعی اور
فلسفہ میں وہ مہارتیں پیدا کیں۔ کہ گویا زمین و آسمان کے اندر دھس گئے۔ مگر
پھر بھی شکوک اور شبہات کی تاریکی سے نجات نہ پا سکے۔ اور اکثر ان میں طرح
طرح کی خطاؤں میں مبتلا ہوگئے۔ اور بیہودہ اوہام میں پڑ کر کہیں کے کہیں چلے
گئے۔ اور اگر ان کو اس صانع کے وجود کی طرف کچھ خیال بھی آیا۔ تو بس اسی قدر
کہ اس اعلےٰ اور عمدہ نظام کو دیکھ کر یہ ان کے دل میں پڑا۔ کہ اس عظیم الشان سلسلہ
کا جو پرحکمت نظام اپنے ساتھ رکھتا ہے کوئی پیدا کرنے والا ضرور چاہئے۔ مگر
ظاہر ہے کہ یہ خیال ناتمام اور یہ معرفت ناقص ہے۔ کیونکہ یہ کہنا کہ اس سلسلہ

فوائد الہام اور علم یقینی کی ضرورت

کے لئے ایک خدا کی ضرورت ہے۔ اس دوسرے کلام سے ہرگز مساوی نہیں۔ کہ وہ خدا درحقیقت ہے بھی غرض یہ ان کی صرف قیاسی معرفت بھی جو دل کو اطمینان اور سکینت نہیں بخش سکتی۔ اور نہ شکوک کو بکلی دل پر سے اٹھا سکتی ہے۔ اور نہ یہ ایسا پیالہ ہے۔ جس سے وہ پیاس معرفت تامہ کی بجھ سکے جو انسان کی فطرت کو لگائی گئی۔ بلکہ ایسی معرفت ناقصہ نہایت پُرخطر ہوتی ہے۔ کیونکہ بہت شور ڈالنے کے بعد پھر آخر ہیچ اور نتیجہ ندارد ہے۔ غرض جب تک خود خدا تعالیٰ اپنے موجود ہونے کو اپنے کلام سے ظاہر نہ کرے۔ جیسا کہ اس نے اپنے کام سے ظاہر کیا۔ تب تک صرف کام کا ملاحظہ تسلی بخش نہیں ہے۔ مثلاً اگر ہم ایک ایسی بند کوٹھڑی کو دیکھیں۔ جس میں یہ بات عجیب ہو کہ اندر سے کنڈیاں لگائی گئی ہیں۔ تو اس فعل سے ہم ضرور اوّل یہ خیال کرینگے۔ کہ کوئی انسان اندر ہے جس نے اندر سے زنجیر کو لگایا ہے۔ کیونکہ باہر سے اندر کی زنجیروں کو لگانا غیر ممکن ہے۔ لیکن جب ایک مدت تک بلکہ برسوں تک باوجود بار بار آواز دینے کے اس انسان کیطرف سے کوئی آواز نہ آئے تو آخر کار یہ رائے ہماری کہ کوئی اندر ہے تبدیل ہو جائیگی۔ اور یہ خیال کرینگے کہ اندر کوئی نہیں۔ بلکہ کسی حکمت عملی سے اندر کی کنڈیاں لگائی گئی ہیں۔ یہی حال ان فلاسفروں کا ہے۔ جنہوں نے صرف فعل کے مشاہدہ پر اپنی معرفت کو ختم کر دیا ہے یہ بڑی غلطی ہے۔ جو خدا کو ایک مُردہ کی طرح سمجھا جائے۔ جس کو قبر سے نکالنا صرف انسان کا کام ہے۔ مگر خدا ایسا ہے۔ جو صرف انسانی کوشش نے اس کا پتہ لگایا ہے۔ تو ایسے خدا کی نسبت ہماری سب امیدیں عبث ہیں۔ بلکہ خدا تو وہی ہے جو ہمیشہ سے اور قدیم سے آپ انا الموجود کہہ کر لوگوں کو اپنی طرف بلاتا رہا ہے یہ بڑی گستاخی ہوگی۔ کہ ہم ایسا خیال کریں۔ کہ اس کی معرفت میں انسان کا احسان اس پر ہے۔ اور اگر فلاسفر نہ ہوتے۔ تو گویا وہ گم کا گم ہی رہتا۔ اور یہ کہنا کہ خدا کیونکر بول سکتا ہے کیا اسکی زبان ہے۔ یہ بھی ایک بڑی بے باکی ہے۔ کیا اس نے

جسمانی ہاتھوں کے بغیر تمام آسمانی اجرام اور زمین کو نہیں بنایا۔ کیا وہ جسمانی آنکھوں کے بغیر تمام دنیا کو نہیں دیکھتا۔ کیا وہ جسمانی کانوں کے بغیر ہماری آوازیں نہیں سنتا۔ پس کیا یہ ضروری نہ تھا۔ کہ اسی طرح وہ کلام بھی کرے۔ یہ بات بھی ہرگز صحیح نہیں ہے کہ خدا کا کلام کرنا آگے نہیں۔ بلکہ پیچھے رہ گیا ہے۔ یہ ہم اس کے کلام اور مخاطبات پر کسی زمانہ تک مہر لگاتے ہیں بیشک وہ اب بھی ڈھونڈنے والوں کو الہامی چشمہ سے مالا مال کرنے کو طیار ہے۔ جیسا کہ پہلے تھا۔ اور اب بھی اس کے فیضان کے ایسے دروازے کھلے ہیں جیسے کہ پہلے تھے۔ ہاں ضرورتوں کے ختم ہونے پر شریعتیں اور حدود ختم ہو گئیں۔ اور تمام رسالتیں اور نبوتیں اپنے آخری نقطہ پر آکر جو ہمارے سید و مولیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود تھا۔ کمال کو پہنچ گئیں۔ اس آخری نور کا عرب سے ظاہر ہونا بھی خالی حکمت سے نہ تھا۔ عرب اس بنی اسمٰعیل کی قوم تھی۔ جو اسرائیل سے منقطع ہو کر حکمت الٰہی سے بیابان فاران میں ڈال دی گئی تھی۔ اور فاران کے معنے ہیں۔ دو فرار کرنے والے۔ یعنی بھاگنے والے۔ پس جن کو خود حضرت ابراہیم نے بنی اسرائیل سے علیحدہ کر دیا تھا۔ ان کا توریت کی شریعت میں کچھ حصہ نہیں رہا تھا۔ جیسا کہ لکھا ہے۔ کہ وہ اسحٰق کے ساتھ حصہ نہیں پائیں گے پس تعلق والوں نے انہیں چھوڑ دیا۔ اور کسی دوسرے سے ان کا تعلق اور رشتہ نہ تھا۔ دوسرے تمام ملکوں میں کچھ کچھ رسوم عبادات اور احکام کے پائے جاتے تھے۔ جن سے پتہ لگتا ہے۔ کہ کسی وقت ان کو نبیوں کی تعلیم پہنچی تھی۔ پس صرف عرب کا ملک ہی ایک ایسا ملک تھا۔ جو ان تعلیموں سے محض ناواقف تھا۔ اور تمام جہان سے پیچھے رہا ہوا تھا۔ اس لئے آخر میں اس کی نوبت آئی اور اس کی نبوت عام ٹھہری۔ تا تمام ملکوں کو دوبارہ برکات کا حصہ دیوے اور جو غلطی پڑ گئی تھی اس کو نکال دے پس ایسی کامل کتاب کے بعد کس کتاب کا انتظار کریں۔ جس نے سارا کام انسانی اصلاح کا اپنے

اسمٰعیل کی وادی

آنحضرت صلعم کی بعثت عرب میں

ہاتھ میں لے لیا۔ اور پہلی کتابوں کی طرح صرف ایک قوم سے واسطہ نہیں رکھا بلکہ تمام قوموں کی اصلاح چاہی۔ اور انسانی تربیت کے تمام مراتب بیان فرمائے وحشیوں کو انسانیت کے آداب سکھائے۔ پھر انسانی صورت بنانے کے بعد اخلاق فاضلہ کا سبق دیا۔ یہ قرآن نے ہی دنیا پر احسان کیا۔ کہ طبعی حالتوں اور اخلاق فاضلہ میں فرق کر کے دکھلایا۔ اور جب طبعی حالتوں سے نکال کر اخلاق فاضلہ کے محل عالی تک پہنچایا تو فقط اسی پر کفایت نہ کی۔ بلکہ اور مرحلہ جو باقی تھا یعنی روحانی حالتوں کا مقام اس تک پہنچنے کے لئے پاک معرفت کے دروازے کھول دئے اور نہ صرف کھول دئے بلکہ لاکھوں انسانوں کو اس تک پہنچا بھی دیا۔ پس اس طرح پر تینوں قسم کی تعلیم جس کا میں پہلے ذکر کر چکا ہوں بکمال خوبی سے بیان فرمائی۔ پس چونکہ وہ تمام تعلیموں کا جن پر دینی تربیت کی ضرورتوں کا مدار ہے۔ کامل طور پر جامع ہے۔ اس لئے یہ دعویٰ اس نے کیا۔ کہ میں نے ہی دائرہ دینی تعلیم کو کمال تک پہنچایا جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ

اسلام کی حقیقت کیا ہے

نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ یعنی آج میں نے دین تمہارا کامل کیا۔ اور اپنی نعمت کو تم پر پورا کر دیا۔ اور میں تمہارا دین اسلام ٹھہرا کر خوش ہوا۔ یعنی دین کا انتہائی مرتبہ وہ امر ہے۔ جو اسلام کے مفہوم میں پایا جاتا ہے یعنی یہ کہ محض خدا کے لئے ہو جانا۔ اور اپنی نجات اپنے وجود کی قربانی سے چاہنا نہ اور طریق سے۔ اور اس نیت اور اس ارادہ کو عملی طور پر دکھلا دینا یہ نقطہ وہ ہے جس پر تمام کمالات ختم ہوتے ہیں۔ پس جس خدا کو حکیموں نے شناخت نہ کیا۔ قرآن نے اس سچے خدا کا پتہ بتایا۔ قرآن نے خدا کی معرفت عطا کرنے کے لئے دو طریق رکھے ہیں۔ اوّل وہ طریق جس کی رو سے انسانی عقل دلائل پیدا کرنے میں بہت قوی اور روشن ہو جاتی ہے اور عقلی غلطی کرنے سے بچ جاتی ہے۔ اور دوسرا روحانی طریق جس کو ہم تیسرے سوال کے جواب میں عنقریب انشاء اللہ تعالیٰ ذکر کریں گے۔ اب دیکھو کہ عقلی طور پر قرآن شریف نے خدا کی ہستی پر کیا کیا عمدہ اور بے مثل دلائل دئے ہیں۔

جیسا کہ ایک جگہ فرماتا ہے۔ رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی یعنی خدا وہ خدا ہے۔ کہ جس نے ہر ایک شے کے مناسب حال اس کو پیدائش بخشی پھر اس شے کو اپنے کمالات مطلوبہ حاصل کرنے کے لئے راہ دکھلا دی۔ اب اگر اس آیت کے مفہوم پر نظر رکھ کر انسان سے لیکر تمام بحری اور بری جانوروں اور پرندوں کی بناوٹ تک دیکھا جائے۔ تو خدا کی قدرت یاد آتی ہے۔ کہ ہر ایک چیز کی بناوٹ اس کے مناسب حال معلوم ہوتی ہے۔ پڑھنے والے خود سوچ لیں۔ کیونکہ یہ مضمون بہت وسیع ہے +

ہستی باری تعالیٰ پر دوسری دلیل

دوسری دلیل خدا تعالیٰ کی ہستی پر قرآن شریف نے خدا تعالیٰ کا علت العلل ہونا قرار دی ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى یعنی تمام سلسلہ علل و معلولات کا تیرے رب پر ختم ہو جاتا ہے۔ تفصیل اس دلیل کی یہ ہے کہ نظر تعمق سے معلوم ہوگا۔ کہ یہ تمام موجودات علل و معلول کے سلسلہ میں موجود ہے۔ اور اسی وجہ سے دنیا میں طرح طرح کے علوم پیدا ہو گئے ہیں۔ کیونکہ کوئی حصہ مخلوقات کا نظام سے باہر نہیں۔ بعض بعض کے لئے بطور اصول اور بعض بطور فروع کے ہیں۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ علت یا تو خود اپنی ذات سے قائم ہوگی۔ یا اس کا وجود کسی دوسری علت کے وجود پر منحصر ہوگا۔ اور پھر یہ دوسری علت کسی اور علت پر۔ وعلیٰ ہذا القیاس اور یہ تو جائز نہیں۔ کہ اس محدود دنیا میں علل و معلول کا سلسلہ کہیں جا کر ختم نہ ہو۔ اور غیر متناہی ہو۔ تو بالضرورت ماننا پڑا۔ کہ یہ سلسلہ ضرور کسی اخیر علت پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ پس جس پر اس تمام سلسلہ کی انتہا ہے۔ وہی خدا ہے۔ آنکھ کھول کر دیکھ لو کہ آیت وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى اپنے مختصر لفظوں میں کس طرح اس دلیل مذکورہ بالا کو بیان فرما رہی ہے جس کے یہ معنی ہیں۔ کہ انتہا تمام سلسلہ کا تیرے رب تک ہے +

پھر ایک اور دلیل اپنی ہستی پر یہ دی۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِیْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۚ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ

يَّسْبَحُوْنَ یعنی آفتاب چاند کو نہیں پکڑ سکتا۔ اور نہ رات جو مظہر ماہتاب ہے دن پر جو مظہر آفتاب ہے کچھ تسلط کر سکتی ہے یعنی کوئی ان میں سے اپنی حدود مقررہ سے باہر نہیں جاتا۔ اگر ان کا در پردہ کوئی مدبر نہ ہو۔ تو یہ تمام سلسلہ درہم برہم ہو جائے یہ دلیل ہیئت پر غور کرنے والوں کے لئے نہایت فائدہ بخش ہے۔ کیونکہ اجرام فلکی کے اتنے بڑے عظیم الشان اور بے شمار گولے ہیں۔ جن کے تھوڑے سے بگاڑ سے تمام دنیا تباہ ہو سکتی ہے۔ یہ کیسی قدرت حق ہے۔ کہ وہ آپس میں نہ ٹکراتے ہیں نہ بال بھر رفتار بدلتے اور نہ اتنی مدت تک کام دینے سے کچھ گھسے اور نہ انکی کلوں پرزوں میں کچھ فرق آیا۔ اگر سر پر کوئی محافظ نہیں۔ تو کیونکر اتنا بڑا کارخانہ بیشمار برسوں سے خود بخود چل رہا ہے۔ انہیں حکمتوں کی طرف اشارہ کر کے خدا تعالےٰ دوسرے مقام میں فرماتا ہے۔ اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی کیا خدا کے وجود میں شک ہو سکتا ہے۔ جس نے ایسے آسمان اور ایسی زمین بنائی ؛

پھر ایک لطیف دلیل اپنی ہستی پر دیتا ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ یعنی ہر ایک چیز معرض زوال میں ہے۔ اور جو باقی رہنے والا ہے وہ خدا ہے جو جلال والا اور بزرگی والا ہے اب دیکھو کہ اگر ہم فرض کر لیں۔ کہ ایسا ہو کہ زمین ذرہ ذرہ ہو جائے اور اجرام فلکی بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ اور ان پر معدوم کرنے والی ایک ایسی ہوا چلے۔ جو تمام نشان ان چیزوں کے مٹا دے۔ مگر پھر بھی عقل اس بات کو مانتی اور قبول کرتی ہے۔ بلکہ صحیح کانشنس اسکو ضروری سمجھتا ہے کہ اس تمام نیستی کے بعد بھی ایک چیز باقی رہ جائے۔ جس پر فنا طاری نہ ہو۔ اور تغیر اور تبدل کو قبول نہ کرے اور اپنی پہلی حالت پر باقی رہے۔ پس وہ وہی خدا ہے۔ جو تمام فانی صورتوں کو ظہور میں لایا ؛

پھر ایک اور دلیل اپنی ہستی پر قرآن شریف میں پیش کرتا ہے۔ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى۔ یعنی میں نے روحوں کو کہا۔ کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ؟ انہوں نے کہا کہ

کیوں نہیں۔ اس آیت میں خدا تعالےٰ قصہ کے رنگ میں رُوحوں کی اس خاصیت کو بیان فرماتا ہے۔ جو اُن کی فطرت میں اس نے رکھی ہوئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کوئی رُوح فطرت کی رو سے خدا تعالیٰ کا انکار نہیں کر سکتی۔ صرف منکروں کو اپنے خیال میں دلیل نہ ملنے کی وجہ سے انکار ہے۔ مگر باوجود اس انکار کے وہ اس بات کو مانتے ہیں۔ کہ ہر ایک حادث کے واسطے ضرور ایک محدث ہے۔ دُنیا میں ایسا کوئی نادان نہیں۔ کہ اگر مثلاً بدن میں کوئی بیماری ظاہر ہو۔ تو وہ اس بات پر اصرار کرے۔ کہ دراصل وہ اس بیماری کے ظہور کی کوئی علت نہیں۔ اگر یہ سلسلہ دنیا کا علل اور معلول سے مربوط نہ ہوتا۔ تو قبل از وقت یہ بتا دینا کہ فلاں تاریخ طوفان آئیگا۔ یا آندھی آئیگی۔ یا خسوف ہوگا۔ یا کسوف ہوگا۔ یا فلاں وقت بیمار مرجائیگا۔ یا فلاں وقت تک ایک بیماری کے ساتھ فلاں بیماری لاحق ہو جائیگی یہ تمام باتیں غیر ممکن ہو جائیں پس ایسا محقق اگرچہ خدا کے وجود کا اقرار نہیں کرتا مگر ایک طور سے تو اس نے اقرار کر ہی دیا۔ کہ وہ بھی ہماری طرح معلولات کے لئے علل کی تلاش میں لگا ہے میں یہ بھی ایک قسم کا اقرار ہے۔ اگرچہ کامل اقرار نہیں یا سوا اس کے اگر کسی ترکیب سے ایک منکر وجود باری کو ایسے طور سے بیہوش کیا جائے کہ وہ اس سفلی زندگی کے خیالات سے بالکل الگ ہو کر اور تمام ارادوں سے معطل رہ کر اعلیٰ ہستی کے قبضہ میں ہو جائے۔ تو وہ اس صورت میں خدا کے وجود کا اقرار کرے گا۔ انکار نہیں کرے گا۔ جیسا کہ اس بڑے بڑے مجربین کا تجربہ شاہد ہے۔ سو ایسی حالت کیطرف اس آیت میں اشارہ ہے اور مطلب آیت کا یہ ہے۔ کہ انکار وجود باری صرف سفلی زندگی تک ہے۔ ورنہ اصل فطرت میں اقرار بھرا ہوا ہے ۔

یہ دلائل وجود باری تعالیٰ ہیں۔ جو ہم نے بطور نمونہ کے لکھدیئے۔ پھر بعد اس کے یہ بھی جاننا چاہیئے۔ کہ جس خدا کی طرف ہمیں قرآن شریف نے بلایا ہے۔ اسکی اس نے یہ صفات لکھی ہیں۔

هُوَ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۖ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيمُ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّينِ ۝ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ ۝ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ ۖ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى ۚ يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ رَبِّ الْعٰلَمِينَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّينِ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۝ اَلْحَيُّ الْقَيُّومُ ۝ قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۚ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ۔ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ ۚ یعنی وہ خدا جو واحد لاشریک ہے۔ جس کے سوا کوئی بھی پرستش اور فرمانبرداری کے لائق نہیں۔ یہ اس لئے فرمایا کہ اگر وہ لاشریک نہ ہو تو شاید اسکی طاقت پر دشمن کی طاقت غالب آجائے۔ اس صورت میں خدائی معرض خطرہ میں رہے گی اور یہ جو فرمایا۔ کہ اس کے سوا کوئی پرستش کے لائق نہیں۔ اس سے یہ مطلب ہے کہ وہ ایسا کامل خدا ہے جسکی صفات اور خوبیاں اور کمالات ایسے اعلیٰ اور بلند ہیں۔ کہ اگر موجودات میں سے بوجہ صفات کاملہ کے ایک خدا کا انتخاب کرنا چاہیں یا دل میں عمدہ سے عمدہ اور اعلیٰ سے اعلیٰ خدا کی صفات فرض کریں۔ تو سب سے اعلیٰ جس سے بڑھ کر کوئی اعلیٰ نہیں ہو سکتا۔ وہی خدا ہے جسکی پرستش میں ادنیٰ کو شریک کرنا ظلم ہے۔ پھر فرمایا کہ عالم الغیب ہے۔ یعنی اپنی ذات کو آپ ہی جانتا ہے۔ اسکی ذات پر کوئی احاطہ نہیں کر سکتا۔ ہم آفتاب اور ماہتاب اور ہر ایک مخلوق کا سراپا دیکھ سکتے ہیں۔ مگر خدا کا سراپا دیکھنے سے قاصر ہیں۔ پھر فرمایا کہ وہ عالم الشہادت ہے۔ یعنی کوئی چیز اس کی نظر سے پردہ میں نہیں ہے۔ یہ جائز نہیں کہ وہ خدا کہلا کر پھر علم اشیاء سے غافل ہو۔ وہ اس عالم کے ذرہ ذرہ پر اپنی نظر رکھتا ہے۔ لیکن انسان نہیں رکھ سکتا۔ وہ جانتا ہے کہ کب اس نظام کو توڑ دیگا۔ اور قیامت برپا کر دے گا۔ اور اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ کہ ایسا کب

ہوگا۔ سو وہی خدا ہے۔ جو ان تمام وقتوں کو جانتا ہے۔ پھر فرمایا۔ کہ ھُوَالرَّحْمٰنُ یعنی وہ جانداروں کی ہستی اور ان کے اعمال سے پہلے محض اپنے لطف سے اور نہ کسی عمل کی پاداش میں اُن کے لئے سامان راحت بیسر کرتا ہے۔ جیسا کہ آفتاب اور زمین اور دوسری تمام چیزوں کو ہمارے وجود اور ہمارے اعمال کے وجود سے پہلے ہمارے لئے بنا دیا۔ اس عطیہ کا نام خدا کی کتاب میں رحمانیت ہے۔ اور اس کام کے لحاظ سے خدا تعالیٰ رحمٰن کہلاتا ہے۔ اور پھر فرمایا کہ اَلرَّحِیْم یعنی وہ خدا نیک عملوں کی نیک تر جزا دیتا ہے اور کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا۔ اور اس کام کے لحاظ سے رحیم کہلاتا ہے اور یہ صفت رحیمیت کے نام سے موسوم ہے اور پھر فرمایا مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ یعنی وہ خدا ہر ایک کی جزا اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اس کا کوئی ایسا کارپرداز نہیں جسکو اس نے زمین آسمان کی حکومت سونپ دی ہو اور آپ الگ بیٹھا ہو۔ اور آپ کچھ نہ کرتا ہو۔ وہی کارپرداز سب کچھ جزا سزا دیتا ہو۔ یا آیندہ دینے والا ہو۔ اور پھر فرمایا۔ اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ یعنی وہ خدا بادشاہ ہے۔ جس پر کوئی داغ عیب نہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانی بادشاہت عیب سے خالی نہیں اگر مثلاً تمام رعیت جلاوطن ہو کر دوسرے ملک کی طرف بھاگ جاوے۔ تو پھر بادشاہی قائم نہیں رہ سکتی۔ اگر مثلاً تمام رعیت قحط زدہ ہو جائے تو پھر خراج شاہی کہاں سے آئے اور اگر رعیت کے لوگ اس سے بحث شروع کر دیں۔ کہ تجھ میں ہم سے زیادہ کیا ہے۔ تو وہ کونسی لیاقت اپنی ثابت کرے۔ پس خدا تعالیٰ کی بادشاہی ایسی نہیں ہے۔ وہ ایک دم میں تمام ملک کو فنا کر کے اور مخلوقات پیدا کر سکتا ہے۔ اگر وہ ایسا خالق اور قادر نہ ہوتا۔ تو پھر بجز ظلم کے اس کی بادشاہت چل نہ سکتی۔ کیونکہ وہ دنیا کو ایک مرتبہ معافی اور نجات دیکر پھر دوسری دنیا کہاں سے لاتا۔ کیا نجات یافتہ لوگوں کو دنیا میں بھیجنے کے لئے پھر پکڑتا اور ظلم کی مدد سے اپنی معافی نجات دہی کو واپس لیتا۔ تو اس صورت میں اسکی خدائی میں فرق آتا۔ اور دنیا کے بادشاہوں کی طرح ایک داغدار بادشاہ

ہوتا جو دنیا کے لئے قانون بناتے ہیں۔ بات بات میں بگڑتے ہیں۔ اور اپنی خود
غرضی کے وقتوں پر جب دیکھتے ہیں۔ کہ ظلم کے بغیر چارہ نہیں۔ تو ظلم کو شیر مادر
سمجھ لیتے ہیں۔ مثلاً قانون شاہی جائز رکھتا ہے۔ کہ ایک جہاز کو بچانے کے لئے
ایک کشتی کے سواروں کو دنیا ہی میں ڈال دیا جائے۔ اور ہلاک کیا جائے۔ مگر
خدا کو یہ اضطرار پیش نہیں آنا چاہیئے پس اگر خدا پورا قادر اور عدم سے پیدا
کرنے والا نہ ہوتا۔ تو وہ یا تو کمزور راجوں کی طرح قدرت کی جگہ ظلم سے کام لیتا
اور یا عادل بنکر خدائی ہی کو الوداع کہتا۔ بلکہ خدا کا جہاز تمام قدرتوں کے ساتھ
سچے انصاف پر چل رہا ہے۔ پھر فرمایا۔ اَلسَّلَامُ یعنی وہ خدا جو تمام عیبوں اور
مصائب اور سختیوں سے محفوظ ہے۔ بلکہ سلامتی دینے والا ہے۔ اس کے معنی
بھی ظاہر ہیں۔ کیونکہ اگر وہ آپ ہی مصیبتوں میں پڑتا۔ لوگوں کے ہاتھ سے مارا
جاتا۔ اور اپنے ارادوں میں ناکام رہتا۔ تو پھر اس بدنمونہ کو دیکھ کر کس طرح دل
تسلی پکڑتے۔ کہ ایسا خدا ہمیں ضرور مصیبتوں سے چھڑا دیگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ
باطل معبودوں کے بارہ میں فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ
لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا
لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ
حَقَّ قَدْرِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ۔ الجزو نمبر ۱۷۔ سورۃ الحج۔ جن لوگوں کو
تم خدا بنائے بیٹھے ہو۔ وہ تو ایسے ہیں۔ کہ اگر سب مل کر ایک مکھی پیدا کرنا چاہیں
تو کبھی پیدا نہ کر سکیں۔ اگرچہ ایک دوسرے کی مدد بھی کریں۔ بلکہ اگر مکھی کوئی ان
کی چیز چھین کر لے جائے۔ تو انہیں طاقت نہیں ہوگی۔ کہ وہ مکھی سے چیز واپس
لے سکیں۔ ان کے پرستار عقل کے کمزور اور وہ طاقت کے کمزور ہیں۔ کیا خدا
ایسے ہوا کرتے ہیں۔ خدا تو وہ ہے۔ کہ سب قوتوں والوں سے زیادہ قوت والا
اور سب پر غالب آنے والا ہے۔ نہ اس کو کوئی پکڑ سکے۔ نہ مار سکے۔ ایسی غلطیوں
میں جو لوگ پڑتے ہیں۔ وہ خدا کا قدر نہیں پہچانتے۔ اور نہیں جانتے۔ خدا کیسا

ہونا چاہیئے۔ اور پھر فرمایا۔ کہ خدا امن کا بخشنے والا اپنے کمالات اور توحید پر دلائل
قائم کرنے والا ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ سچے خدا کا ماننے والا کسی
مجلس میں شرمندہ نہیں ہو سکتا۔ اور نہ خدا کے سامنے شرمندہ ہوگا۔ کیونکہ اس
کے پاس زبردست دلائل ہوتے ہیں لیکن بناوٹی خدا کا ماننے والا بڑی مصیبت
میں ہوتا ہے۔ وہ بجائے دلائل بیان کرنے کے ہر ایک بیہودہ بات کو ان میں
داخل کرتا ہے تا ہنسی نہ ہو۔ اور ثابت شدہ غلطیوں کو چھپاتا ہے۔

اور پھر فرمایا کہ اَلْمُهَيْمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ۔ یعنی وہ
سب کا محافظ ہے اور سب پر غالب اور بگڑے ہوئے کاموں کا بنانے والا ہے
اور اسکی ذات نہایت ہی مستغنی ہے۔ اور فرمایا۔ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ
الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰى۔ یعنی وہ ایسا خدا ہے کہ جسموں کا بھی
پیدا کرنے والا اور روحوں کا بھی پیدا کرنے والا رحم میں تصویر کھینچنے والا ہے تمام
نیک نام جہاں تک خیال میں آسکیں سب اسی کے نام ہیں۔ اور پھر فرمایا
يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ یعنی
آسمان کے لوگ بھی اُس کے نام کو پاکی سے یاد کرتے ہیں۔ اور زمین کے لوگ بھی۔
اس آیت میں اشارہ فرمایا۔ کہ آسمانی اجرام میں آبادی ہے۔ اور وہ لوگ بھی
پابند خدا کی ہدایتوں کے ہیں۔ اور پھر فرمایا عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ یعنی خدا
بڑا قادر ہے۔ یہ پرستاروں کے لیئے تسلی ہے کیونکہ اگر خدا عاجز ہو۔ اور
قادر نہ ہو۔ تو ایسے خدا سے کیا امید رکھیں۔ اور پھر فرمایا کہ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ
الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ أُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ
إِذَا دَعَانِ۔ یعنی وہی خدا ہے۔ جو تمام عالموں کا پرورش کرنے والا رحمٰن رحیم
اور جزا کے دن کا آپ مالک ہے۔ اس اختیار کو کسی کے ہاتھ میں نہیں دیا۔ ہر
ایک پکارنے والے کی پکار کو سننے والا اور جواب دینے والا یعنی دعاؤں کا قبول
کرنے والا۔ اور پھر فرمایا۔ اَلْحَیُّ الْقَيُّوْمُ۔ یعنی ہمیشہ رہنے والا اور تمام جانوں کا

کی جان اور سب کے وجود کا سہارا۔ یہ اس لئے کہا۔ کہ وہ ازلی۔ ابدی نہ ہو تو اس کی
زندگی کے بارے میں بھی دھڑکا رہے گا۔ کہ شاید ہم سے پہلے فوت نہ ہو جائے۔ اور
پھر فرمایا۔ کہ وہ خدا اکیلا خدا ہے۔ نہ وہ کسی کا بیٹا۔ اور نہ کوئی اس کا بیٹا۔ اور نہ
کوئی اس کے برابر۔ نہ کوئی اس کا ہمجنس +

قرآن میں میانہ روی کی تعلیم

اور یاد رہے۔ کہ خدا تعالیٰ کی توحید کو صحیح طور پر ماننا اور اس میں زیادت
یا کمی نہ کرنا یہ وہ عدل ہے۔ جو انسان اپنے مالک حقیقی کے حق میں بجا لاتا ہے
یہ تمام حصہ اخلاقی تعلیم کا ہے۔ جو قرآن شریف کی تعلیم میں سے درج ہوا
ہے۔ اس میں اصول یہ ہے۔ کہ خدا تعالیٰ نے تمام اخلاق کو افراط اور تفریط
سے بچایا ہے۔ اور ہر ایک خلق کو اس حالت میں خلق کے نام سے موسوم کیا ہے
کہ جب اپنی واقعی اور واجب حد سے کم و بیش نہ ہو۔ یہ تو ظاہر ہے کہ نیکی
حقیقی وہی چیز ہے۔ جو دو حدوں کے وسط میں ہوتی ہے۔ یعنی زیادتی اور کمی یا افراط
اور تفریط کے درمیان ہوتی ہے ہر ایک عادت جو وسط کی طرف کھینچے۔ اور وسط پر
قائم کرے۔ وہی خلق فاضل کو پیدا کرتی ہے محل اور موقعہ کا پہچاننا ایک وسط ہے
مثلاً اگر زمیندار اپنا تخم وقت سے پہلے بووے یا وقت کے بعد دونوں صورتوں
میں وہ وسط کو چھوڑتا ہے۔ نیکی اور حکمت سب وسط میں ہے۔ اور وسط موقع
بینی میں یا یوں سمجھ لو۔ کہ حق وہ چیز ہے کہ ہمیشہ دو متقابل باطلوں کے وسط میں
ہوتا ہے۔ اور اس میں شک نہیں کہ عین موقعہ کا التزام ہمیشہ انسان کو وسط
میں رکھتا ہے۔ اور خداشناسی کے بارے میں وسط کی شناخت یہ ہے کہ خدا
کی صفات کے بیان کرنے میں نہ تو نفی صفات کے پہلو کی طرف جھک جائے اور
نہ خدا کو جسمانی چیزوں کا مشابہ قرار دے۔ یہی طریق قرآن شریف نے صفات
باری تعالیٰ میں اختیار کیا ہے۔ چنانچہ وہ یہ بھی فرماتا ہے۔ کہ خدا دیکھتا سنتا جانتا
بولتا کلام کرتا ہے اور پھر مخلوق کی مشابہت سے بچانے کے لئے یہ بھی فرماتا
ہے۔ لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ ۔ فَلَا تَضْرِبُوا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ۔ یعنے خدا کی ذات

اور صفات میں کوئی شریک اس کا نہیں۔ اُس کے لئے مخلوق سے مثالیں مت دو سو خدا کی ذات کو تشبیہ اور تنزیہ کے بین بین رکھنا یہی وسط ہے غرض اسلام کی تعلیم تمام میانہ روی کی تعلیم ہے۔ سورۂ فاتحہ بھی میانہ روی کی ہدایت فرماتی ہے کیونکہ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ۔ مغضوب علیہم سے وہ لوگ مراد ہیں۔ جو خدا تعالیٰ کے مقابل پر قوت غضبی کو استعمال کر کے قوی سبعیہ کی پیروی کرتے ہیں۔ اور ضالین سے وہ مراد ہیں جو قوی بہیمیہ کی پیروی کرتے ہیں۔ اور میانہ طریق وہ ہے جس کو لفظ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ سے یاد فرمایا ہے۔ غرض اس مبارک اُمت کے لئے قرآن شریف میں وسط کی ہدایت ہے۔ توریت میں خدا تعالیٰ نے انتقامی امور پر زور دیا تھا۔ اور انجیل میں عفو اور درگذر پر زور دیا تھا۔ اور اس اُمت کو موقعہ شناسی اور وسط کی تعلیم ملی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا۔ یعنی ہم نے تم کو وسط پر عمل کرنے والے بنایا۔ اور وسط کی تعلیم دی۔ سو مبارک وہ جو وسط پر چلتے ہیں۔ خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا ؛

تیسرا سوال یعنی یہ کہ روحانی حالتیں کیا ہیں۔ واضح رہے کہ ہم پہلے اس سے بیان کر چکے ہیں۔ کہ بموجب ہدایت قرآن شریف کے روحانی حالتوں کا منبع اور سرچشمہ نفس مطمئنہ ہے۔ جو انسان کو با اخلاق ہونے کے مرتبہ سے باخدا ہونے کے مرتبہ تک پہنچاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے۔ یٰاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ۔ یعنی اے نفس خدا کے ساتھ آرام یافتہ اپنے رب کیطرف واپس چلا آ۔ وہ تجھ سے راضی اور تو اس سے راضی۔ پس میرے بندوں میں داخل ہو جا۔ اور میرے بہشت کے اندر آ۔ اس جگہ بہتر ہے کہ ہم روحانی حالتوں کے بیان کرنے کے لئے اس آیت کریمہ کی تفسیر کسی قدر توضیح سے بیان کریں پس یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اعلیٰ درجہ کی روحانی حالت انسان کی اس دنیوی زندگی میں یہ ہے

کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ آرام پا جائے اور اطمینان اور سرور اور لذت اس کی جدا
دنیا کو بہشت بنا دیتا ہے
میں ہی ہو جائے یہی وہ حالت ہے جس کو دوسرے لفظوں میں بہشتی زندگی
کہا جاتا ہے۔ اس حالت میں انسان اپنے کامل صدق اور صفا اور وفا کے
کے بدلہ میں ایک نقد بہشت پا لیتا ہے۔ اور دوسرے لوگوں کی بہشت موعود
پر نظر ہوتی ہے۔ اور یہ بہشت موجود میں داخل ہوتا ہے۔ اسی درجہ پر پہنچ
کر انسان سمجھتا ہے۔ کہ وہ عبادت جس کا بوجھ اس کے سر پر ڈالا گیا ہے۔
درحقیقت وہی ایک ایسی غذا ہے جس سے اسکی روح نشوونما پاتی
ہے۔ اور جس پر اسکی روحانی زندگی کا بڑا بھاری مدار ہے اور اس کے نتیجہ کا حصول
کسی دوسرے جہان پر موقوف نہیں ہے۔ اسی مقام پر یہ بات حاصل ہوتی ہے
کہ وہ ساری ملامتیں جو نفس لوامہ انسان کا اسکی ناپاک زندگی پر کرتا ہے۔ اور
پھر بھی نیک خواہشوں کو اچھی طرح ابھار نہیں سکتا۔ اور بری خواہشوں سے
حقیقی نفرت نہیں دلا سکتا۔ اور نہ نیکی پر ٹھہرنے کی پوری قوت بخش سکتا ہے
اس پاک تحریک سے بدل جاتی ہیں۔ جو نفس مطمئنہ کے نشوونما کا آغاز ہوتی ہے
اور اس درجہ پر پہنچ کر وقت آجاتا ہے کہ انسان پوری فلاح حاصل کرے۔ اب
تمام نفسانی جذبات خود بخود افسردہ ہونے لگتے ہیں۔ اور روح پر ایک ایسی
طاقت افزا ہوا چلنے لگتی ہے جس سے انسان پہلی کمزوریوں کو ندامت کی نظر سے
دیکھتا ہے۔ اس وقت انسانی سرشت پر ایک بھاری انقلاب آتا ہے۔ اور عادات
میں ایک تبدیل عظیم پیدا ہوتا ہے۔ اور انسان اپنی پہلی حالتوں سے بہت ہی
دور جا پڑتا ہے۔ دھویا جاتا ہے۔ اور صاف کیا جاتا ہے۔ اور خدا نیکی کی محبت
کو اپنے ہاتھ سے اس کے دل میں لکھ دیتا ہے۔ اور بدی کا گند اپنے ہاتھ سے اس
کے دل سے باہر پھینک دیتا ہے۔ سچائی کی فوج سب کی سب دل کے شہرستان
میں آجاتی ہے۔ اور فطرت کے تمام برجوں پر راستبازی کا قبضہ ہو جاتا ہے
اور حق کی فتح ہوتی ہے اور باطل بھاگ جاتا ہے اور اپنے ہتھیار پھینک دیتا

ہے۔ اس شخص کے دل پر خدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ اور ہر ایک قدم خدا کے زیر سایہ
چلتا ہے۔ چنانچہ خداتعالے آیات ذیل میں انہیں امور کی طرف اشارہ فرماتا ہی
أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ وَ
زَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ ۝
أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ ۝ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ
حَكِيمٌ ۝ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا ۝ یعنی خدا
نے مومنوں کے دل میں ایمان کو اپنے ہاتھ سے لکھ دیا ہے اور روح القدوس کے
ساتھ ان کی مدد کی اس نے لے مومنو! ایمان کو تمہارا محبوب بنا دیا۔ اور اس کا حسن و
جمال تمہارے دل میں بٹھا دیا۔ اور کفر اور بدکاری اور معصیت سے تمہارے دل کو
نفرت دیدی اور بری راہوں کا مکروہ ہونا تمہارے دل میں جما دیا۔ یہ سب کچھ خدا
کے فضل اور رحمت سے ہوا۔ حق آیا اور باطل بھاگ گیا۔ اور باطل کب حق کے
مقابل ٹھہر سکتا تھا غرض یہ تمام اشارات اس روحانی حالت کی طرف ہیں۔ جو تیسرے
درجہ پر انسان کو حاصل ہوتی ہے اور سچی بینائی انسان کو کبھی نہیں مل سکتی۔ جب تک
یہ حالت اس کو حاصل نہ ہو۔ اور یہ جو خداتعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے ایمان انکے
دل میں اپنے ہاتھ سے لکھا اور روح القدوس سے ان کی مدد کی۔ یہ اس بات کی
طرف اشارہ ہے۔ کہ انسان کو سچی طہارت اور پاکیزگی کبھی حاصل نہیں ہو سکتی۔
جب تک آسمانی مدد اس کے شامل حال نہ ہو۔ نفس لوامہ کے مرتبہ پر انسان کا
یہ حال ہوتا ہے کہ بار بار توبہ کرتا اور بار بار گرتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات اپنی
صلاحیت سے نا امید ہو جاتا ہے اور اپنے مرض کو ناقابل علاج سمجھ لیتا
ہے۔ اور ایک مدت تک ایسا ہی رہتا ہے۔ اور پھر جب وقت مقدر
پورا ہو جاتا ہے۔ تو رات یا دن کو یک دفعہ ایک نور اس پر نازل ہوتا ہی
اور اس نور میں الٰہی قوت ہوتی ہے۔ اس نور کے نازل ہونے کے ساتھ
ہی ایک عجیب تبدیلی اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہے۔ اور غیبی ہاتھ کا ایک

[illegible]

قوی تصرف محسوس ہوتا ہے اور ایک عجیب عالم سامنے آجاتا ہے۔ اس وقت انسان کو پتہ لگتا ہے۔ کہ خدا ہے۔ اور آنکھوں میں وہ نور آجاتا ہے۔ جو پہلے نہیں تھا۔ لیکن اس راہ کو کیونکر حاصل کریں۔ اور اس روشنی کو کیونکر پاویں سو جاننا چاہیئے۔ کہ اس دنیا میں جو دارالاسباب ہے۔ ہر ایک معلول کے لئے ایک علّت ہے۔ اور ہر ایک حرکت کے لئے ایک محرک ہے۔ اور ہر ایک علم حاصل کرنے کے لئے ایک راہ ہے جس کو صراط مستقیم کہتے ہیں۔ دنیا میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں۔ جو بغیر پابندی ان قواعد کے مل سکے۔ جو قدرت نے ابتدا سے اس کے لئے مقرر کر رکھے ہیں۔ قانون قدرت بتلا رہا ہے۔ کہ ہر ایک چیز کے حصول کے لئے ایک صراط مستقیم ہے۔ اور اس کا حصول اسی پر قدرتاً موقوف ہے۔ مثلاً اگر ہم ایک اندھیری کوٹھڑی میں بیٹھے ہوں۔ اور آفتاب کی روشنی کی ضرورت ہو۔ تو ہمارے لئے یہ صراط مستقیم ہے کہ ہم اس کھڑکی کو کھول دیں۔ جو آفتاب کی طرف ہے تب یکدفعہ آفتاب کی روشنی اندر آکر ہمیں منوّر کر دے گی۔ سو ظاہر ہے کہ اسی طرح خدا کے سچے اور واقعی فیوض پانے کے لئے بھی کوئی کھڑکی ہوگی۔ اور پاک روحانیت کے حاصل کرنے کے لئے کوئی خاص طریق ہوگا۔ اور وہ یہ ہے کہ روحانی امور کے لئے صراط مستقیم کی تلاش کریں۔ جیسا کہ ہم اپنی زندگی کے تمام امور میں اپنی کامیابیوں کے لئے صراط مستقیم کی تلاش کرتے رہتے ہیں۔ مگر کیا وہ یہ طریق ہے۔ کہ ہم صرف اپنی ہی عقل کے زور سے اور اپنی ہی خود تراشیدہ باتوں سے خدا کے وصال کو ڈھونڈیں۔ کیا محض ہماری ہی اپنی منطق اور فلسفہ سے اس کے وہ دروازے ہم پر کھلتے ہیں۔ جن کا کھلنا اس کے قوی ہاتھ پر موقوف ہے۔ یقیناً سمجھو۔ کہ یہ بالکل صحیح نہیں ہے۔ ہم اس حی و قیوم کو محض اپنی ہی تدبیروں سے ہرگز نہیں پا سکتے۔ بلکہ اس راہ میں صراط مستقیم صرف یہ ہے کہ پہلے ہم اپنی زندگی معہ اپنی تمام قوتوں کے خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف کرکے پھر خدا کے وصال کے لئے دعا میں

صراط وصال: دعا سے

لگے رہیں۔ نا خدا کو خدا ہی کے ذریعہ سے یاد ہیں۔ اور سب سے زیادہ پیاری دعا جو عین محل اور موقعہ سوال کا ہمیں سکھاتی ہے۔ اور فطرت کے روحانی جوش کا نقشہ ہمارے سامنے رکھتی ہے۔ وہ دعا ہے جو خدائے کریم نے اپنی پاک کتاب قرآن شریف میں یعنی سورہ فاتحہ میں ہمیں سکھائی ہے۔ اور وہ یہ ہے۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ تمام پاک تعریفیں جو ہو سکتی ہیں۔ اس اللہ کے لئے ہیں۔ جو تمام جہانوں کا پیدا کرنے والا اور قائم رکھنے والا ہے۔ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ وہی خدا جو ہمارے اعمال سے پہلے ہمارے لئے رحمت کا سامان میسر کرنے والا ہے۔ اور ہمارے اعمال کے بعد رحمت کے ساتھ جزا دینے والا ہے۔ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ وہ خدا جو جزا کے دن کا وہی ایک مالک ہے کسی اور کو وہ دن نہیں سونپا گیا۔ اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ اے وہ جو ان تعریفوں کا جامع ہے ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں۔ اور ہم ہر ایک کام میں توفیق تجھ ہی سے چاہتے ہیں۔ اس جگہ "ہم" کے لفظ سے پرستش کا اقرار کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہمارے تمام قویٰ تیری پرستش میں لگے ہوئے ہیں۔ اور تیرے آستانہ پر جھکے ہوئے ہیں۔ کیونکہ انسان با عتبار اپنے اندرونی قویٰ کے ایک جماعت اور ایک اُمت ہے۔ اور اس طرح پر تمام قویٰ کا خدا کو سجدہ کرنا یہی وہ حالت ہے جس کو اسلام کہتے ہیں اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ ہمیں اپنی سیدھی راہ دکھا۔ اور اس پر ثابت قدم کر کے ان لوگوں کی راہ دکھلا۔ جن پر تیرا انعام و اکرام ہے اور تیرے مورد فضل و کرم ہو گئے ہیں غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ وَلَا الضَّآلِّیْنَ اور ہمیں ان لوگوں کی راہوں سے بچا۔ جن پر تیرا غضب ہے اور جو تجھ تک نہیں پہنچ سکے اور راہ کو بھول گئے۔ آمین۔ "اے خدا ایسا ہی کر"۔ یہ آیات سمجھا رہی ہیں کہ خدا تعالیٰ کے انعامات جو دوسرے لفظوں میں فیوض کہلاتے ہیں انہی پر نازل ہوتے ہیں۔ جو اپنی زندگی کی خدا کی راہ میں قربانی دے کر اور اپنا

سورۂ فاتحہ کا لفظی ترجمہ

تمام وجود اسکی راہ میں وقف کرکے اور اس کی رضا میں محو ہو کر پھر اس وجہ سے دُعا میں لگے رہتے ہیں۔ کہ تا جو کچھ انسان کو رُوحانی نعمتوں اور خدا کے قرب اور وصال اور اس کے مکالمات اور مخاطبات میں سے مل سکتا ہے۔ وہ سب ان کو ملے۔ اور اس دُعا کے ساتھ اپنے تمام قویٰ سے عبادت بجالاتے ہیں۔ اور گناہ سے پرہیز کرتے اور آستانہ الٰہی پر پڑے رہتے ہیں۔ اور جہاں تک ان کے لئے ممکن ہے اپنے تئیں بدی سے بچاتے ہیں۔ اور غضب الٰہی کی راہوں سے دُور رہتے ہیں۔ سو چونکہ وہ ایک اعلیٰ ہمت اور صدق کے ساتھ خدا کو ڈھونڈتے ہیں۔ اسی لئے اسکو پالیتے ہیں۔ اور خدا تعالےٰ کی پاک معرفت کے پیالوں سے سیراب کئے جاتے ہیں اس آیت میں جو استقامت کا ذکر فرمایا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ سچا اور کامل فیض جو روحانی عالم تک پہنچاتا ہے۔ کامل استقامت سے وابستہ ہے۔ اور کامل

تعریف استقامت

استقامت سے مراد ایک ایسی حالت صدق و وفا ہے۔ جس کو کوئی امتحان ضرر نہ پہنچا سکے۔ یعنی ایسا پیوند ہو جس کو نہ تلوار کاٹ سکے۔ نہ آگ جلا سکے۔ اور نہ کوئی دوسری آفت نقصان پہنچا سکے۔ عزیزوں کی موتیں اس سے علیحدہ نہ کر سکیں۔ پیاروں کی جدائی اس میں خلل انداز نہ ہو سکے۔ بے آبروئی کا خوف کچھ رعب نہ ڈال سکے۔ ہولناک دُکھوں سے مارا جانا ایک ذرہ دل کو نہ ڈرا سکے۔ سو یہ دروازہ نہایت تنگ ہے اور یہ راہ نہایت دشوار گذار ہے۔ کسقدر مشکل ہے۔ آہ! صد آہ! اسی کیطرف اللہ جلشانہٗ ان آیات میں اشارہ فرماتا ہے۔ قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآءُکُمْ وَاَبْنَآءُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْہَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَہَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَہَاۤ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِہَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ وَاللّٰہُ لَا یَہْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ۝ یعنی ان کو کہدے۔ کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری عورتیں اور تمہاری برادری اور تمہارے وہ مال جو تم نے محنت سے کمائے ہیں۔ اور تمہاری سوداگری جس کے بند ہونے کا تمہیں خوف ہے

ور تمہاری حویلیاں جو تمہارے دل پسند ہیں۔ خدا سے اور اسکے رسول سے اور خدا
کی راہ میں اپنی جانوں کو لڑانے سے زیادہ پیارے ہیں۔ تو تم اس وقت تک منتظر
رہو۔ کہ جب تک خدا اپنا حکم ظاہر کرے۔ اور خدا بدکاروں کو کبھی اپنی راہ نہیں
دکھائے گا۔ ان آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ خدا کی مرضی کو چھوڑ کر اپنے
عزیزوں اور اپنے مالوں سے پیار کرتے ہیں۔ وہ خدا کی نظر میں بدکار ہیں وہ ضرور
ہلاک ہونگے۔ کیونکہ انہوں نے غیر کو خدا پر مقدم رکھا۔ یہی وہ تیسرا مرتبہ ہے
جس میں وہ شخص با خدا بنتا ہے۔ کیونکہ جو اس کے لئے ہزاروں بلائیں خریدے
اور خدا کی طرف ایسے صدق اور اخلاص سے جھک جائے۔ کہ خدا کے سوا کوئی
اس کا نہ رہے۔ گویا سب مر گئے ہیں سچ تو یہ ہے۔ کہ جب تک ہم خود نہ مریں
زندہ خدا نظر نہیں آسکتا۔ خدا کے ظہور کا دن وہی ہوتا ہے۔ کہ جب ہماری
جسمانی زندگی پر موت آوے ہم اندھے ہیں۔ جب تک غیر کے دیکھنے سے اندھے
نہ ہو جائیں۔ ہم مردہ ہیں جب تک خدا کے ہاتھ میں مُردہ کی طرح نہ ہو جائیں۔ جب
ہمارا منہ ٹھیک ٹھیک اس کے محاذات میں پڑے گا۔ تب وہ واقعی استقامت
جو تمام نفسانی جذبات پر غالب آتی ہے ہمیں حاصل ہوگی۔ اس سے پہلے نہیں
اور یہی وہ استقامت ہے جس سے نفسانی زندگی پر موت آجاتی ہے۔ ہماری
استقامت یہ ہے۔ کہ جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ کہ بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ
وَھُوَ مُحْسِنٌ۔ یعنی یہ کہ قربانی کی طرح میرے آگے گردن رکھ دو۔ ایسا ہی ہم اس
وقت درجۂ استقامت حاصل کرینگے۔ کہ جب ہمارے وجود کے تمام پُرزے
اور ہمارے نفس کی تمام قوتیں اسی کے کام میں لگ جائیں۔ اور ہماری موت اور
ہماری زندگی اسی کے لئے ہو جائے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ
نُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ یعنی کہہ میری نماز اور میری قربانی
اور میرا زندہ رہنا اور میرا مرنا سب خدا کے لئے ہے۔ اور جب انسان کی محبت
خدا کے ساتھ اس درجہ تک پہنچ جائے۔ کہ اُس کا مرنا اور جینا اپنے لئے نہیں

خدا نما ہونے کا درجہ

بلکہ خدا ہی کے لئے ہو جائے۔ تب وہ خدا جو ہمیشہ سے پیار کرنے والوں کے ساتھ
پیار کرتا آیا ہے۔ اپنی محبت کو اس پر اُتارتا ہے۔ اور ان دونوں محبتوں کے ملنے
سے انسان کے اندر ایک نور پیدا ہوتا ہے۔ جس کو دنیا نہیں پہچانتی۔ اور نہ سمجھ
سکتی ہے۔ اور ہزاروں صدیقوں اور برگزیدوں کا اسی لئے خون ہوا کہ دنیا نے
ان کو نہیں پہچانا۔ وہ اسی لئے مکار اور خود غرض کہلائے۔ کہ دنیا ان کے نورانی چہرہ
کو دیکھ نہ سکی۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ وَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ
یعنی وہ جو منکر ہیں۔ تیری طرف دیکھتے تو ہیں۔ مگر تو انہیں نظر نہیں آتا۔ غرض جب وہ
نور پیدا ہوتا ہے تو اس نور کی پیدائش کے دن سے ایک زمینی شخص آسمانی ہو جاتا ہے
وہ جو ہر ایک وجود کا مالک ہے اس کے اندر بولتا ہے۔ اور اپنی اُلوہیت کی چمکیں
دکھلاتا ہے۔ اور اس کے دل کو کہ جو پاک محبت سے بھرا ہوا ہے۔ اپنا تخت گاہ
بناتا ہے۔ اور جب ہی سے کہ یہ شخص ایک نورانی تبدیلی پا کر ایک نیا آدمی ہو جاتا
ہے۔ وہ اس کے لئے ایک نیا خدا ہو جاتا ہے۔ اور نئی عادتیں اور نئی سنتیں ظہور
میں لاتا ہے۔ یہ نہیں کہ وہ نیا خدا ہے۔ یا عادتیں نئی ہیں۔ مگر خدا کی عام عادتوں
سے وہ الگ عادتیں ہوتی ہیں۔ جو دنیا کا فلسفہ اُن سے آشنا نہیں اور یہ شخص
جیسا کہ اللہ جلّ شانہ نے فرمایا ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَہُ ابْتِغَاءَ
مَرْضَاتِ اللّٰہِ ط وَاللّٰہُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ۔ یعنی انسانوں میں وہ اعلیٰ درجہ کے
انسان ہیں جو خدا کی رضا میں کھوئے جاتے ہیں۔ وہ اپنی جان بیچتے ہیں۔ اور خدا
کی مرضی کو مول لے لیتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں۔ جن پر خدا کی رحمت ہے ایسا ہی وہ
شخص جو روحانی حالت کے مرتبہ تک پہنچ گیا ہے۔ خدا کی راہ میں فدا ہو جاتا ہے
خدا تعالیٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ تمام دُکھوں سے وہ شخص نجات پاتا ہے جو
میری راہ میں اور میری رضا کی راہ میں جان کو بیچ دیتا ہے۔ اور جانفشانی کے ساتھ
اپنی اس حالت کا ثبوت دیتا ہے۔ کہ وہ خدا کا ہے اور اپنے تمام وجود کو ایک ایسی
چیز سمجھتا ہے۔ جو طاعت خالق اور خدمت مخلوق کے لئے بنائی گئی ہے۔ اور پھر حقیقی

نیکیاں جو ہر ایک قوت سے متعلق ہیں ایسے شوق و ذوق و حضور دل سے بجالاتا ہے کہ گویا وہ اپنی فرمانبرداری کے آئینہ میں اپنے محبوب حقیقی کو دیکھ رہا ہے اور ارادہ اس کا خدائے تعالیٰ کے ارادہ سے ہمرنگ ہو جاتا ہے۔ اور تمام لذات اسکی فرمانبرداری میں ٹھہر جاتی ہے۔ اور تمام اعمال صالحہ نہ مشقت کی راہ سے بلکہ تلذذ اور احتظاظ کی کشش سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ وہ نقد بہشت ہے جو روحانی انسان کو ملتا ہے۔ اور وہ بہشت جو آئندہ ملے گا۔ وہ درحقیقت اسی کی اظلال و آثار ہے۔ جس کو دوسرے عالم میں قدرت خداوندی جسمانی طور پر متمثل کرکے دکھائیگی۔ اسی کیطرف اشارہ ہے۔ جو اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے۔ وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ ۝ وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۝ اِنَّ الْاَبْرَارَ یَشْرَبُوْنَ مِنْ كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا ۝ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ یُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِیْرًا ۝ یُسْقَوْنَ فِیْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِیْلًا ۝ عَیْنًا فِیْهَا تُسَمّٰى سَلْسَبِیْلًا ۝ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ سَلٰسِلَاۡ وَاَغْلٰلًا وَّسَعِیْرًا ۝ وَمَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖۤ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِیْلًا ۝ یعنی جو شخص خدا تعالیٰ سے خائف ہے اور اسکی عظمت و جلال کے مرتبہ سے ہراساں ہے۔ اس کے لئے دو بہشت ہیں۔ ایک یہی دنیا اور دوسری آخرت۔ اور ایسے لوگ جو خدا میں محو ہیں۔ خدا نے ان کو وہ شربت پلایا ہے۔ جس نے اِن کے دل اور خیالات اور ارادات کو پاک کر دیا۔ نیک بندے وہ شربت پی رہے ہیں جسکی ملونی کافور ہے۔ وہ اس چشمہ سے پیتے ہیں جس کو وہ آپ ہی چیرتے ہیں۔ اور میں پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔ کہ کافور کا لفظ اس واسطے اس آیت میں اختیار فرمایا گیا ہے۔ کہ لغتِ عرب میں کفر دبانے اور ڈھانکنے کو کہتے ہیں۔ سو یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انہوں نے ایسے خلوص سے انقطاع اور رجوع الی اللہ کا پیالہ پیا ہے کہ دنیا کی محبت بالکل ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ تمام جذبات دل

مومن کے لئے دو بہشت

کے خیال سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب دل نالائق خیالات سے بہت ہی دُور چلا جائے۔ اور کچھ تعلقات ان سے باقی نہ رہیں۔ تو وہ جذبات بھی آہستہ آہستہ کم ہونے لگتے ہیں۔ یہانتک کہ نابود ہو جاتے ہیں۔ سو اس جگہ خدا تعالیٰ کی یہی غرض ہے۔ اور وہ اس آیت میں یہی سمجھاتا ہے۔ کہ جو اس کی طرف کامل طور سے جُھک گئے۔ وہ نفسانی جذبات سے بہت ہی دُور نکل گئے ہیں۔ اور ایسے خدا کی طرف جُھکے کہ دنیا کی سرگرمیوں سے اُنکے دل ٹھنڈے ہو گئے۔ اور ان کے جذبات ایسے دَب گئے۔ جیسا کہ کافور زہریلے مادوں کو دبا دیتا ہے۔ اور پھر فرمایا۔ کہ وہ لوگ اس کافوری پیالہ کے بعد وہ پیالے پیتے ہیں۔ جنکی ملونی زنجبیل ہے۔ اب جاننا چاہیئے۔ کہ زنجبیل دو لفظوں سے مرکب ہے یعنی زنا اور جبل سے۔ اور زنا لغت عرب میں اُوپر چڑھنے کو کہتے ہیں اور جبل پہاڑ کو۔ اس کے ترکیبی معنی یہ ہیں۔ کہ پہاڑ پر چڑھ گیا۔ اب جاننا چاہیئے۔ کہ انسان پر ایک زہریلی بیماری کے فرد ہونے کے بعد اعلیٰ درجہ کی صحت تک دو حالتیں آتی ہیں۔ ایک وہ حالات جبکہ زہریلے مادے کا جوش بکلی جاتا رہتا ہے۔ اور خطرناک مادوں کا جوش رو باصلاح ہو جاتا ہے۔ اور سمی کیفیات کا حملہ بخیر و عافیت گذر جاتا ہے۔ اور ایک مہلک طوفان جو اُٹھا تھا نیچے دَب جاتا ہے۔ لیکن ہنوز اعضاء میں کمزوری باقی ہے۔ کوئی طاقت کا کام نہیں ہو سکتا۔ ابھی مُردہ کی طرح اُفتاں و خیزاں چلتا ہے۔ اور دوسری وہ حالت ہے کہ جب اصل صحت عود کر آتی ہے۔ اور بدن میں طاقت بھر جاتی ہے۔ اور قوت کے بحال ہونے سے یہ حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ کہ بلا تکلف پہاڑ کے اُوپر چڑھ جائے اور نشاط خاطر سے اُونچی گھاٹیوں پر دوڑتا چلا جائے۔ سو سلوک کے تیسرے مرتبہ میں یہ حالت میسر آتی ہے۔ ایسی حالت کی نسبت اللہ تعالیٰ آیت موصوفہ میں اشارہ فرماتا ہے۔ کہ انتہائی درجہ کے باخدا لوگ وہ پیالے پیتے ہیں۔ جن میں زنجبیل ملی ہوئی ہے۔ یعنی وہ روحانی حالت کی پوری قوت

لفظ زنجبیل کے لفظی معنی

پاکر بڑی بڑی گھاٹیوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ اور بڑے مشکل کام ان کے ہاتھ سے انجام پذیر ہوتے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ کی راہ میں حیرت ناک جانفشانیاں دکھلاتے ہیں +

اس جگہ یہ بھی واضح رہے کہ علم طب کی رُو سے زنجبیل وہ دوا ہے جسکو ہندی میں سونٹھ کہتے ہیں۔ وہ حرارت غریزی کو بہت قوت دیتی ہے۔ اور دستوں کو بند کرتی ہے اور اس کا نام زنجبیل اسی واسطے نام رکھا گیا ہے۔ کہ گویا وہ کمزور کو ایسا قوی کرتی ہے۔ اور ایسی گرمی پہنچاتی ہے۔ جس سے وہ پہاڑوں پر چڑھ سکے ان متقابل آیتوں کے پیش کرنے سے جن میں ایک جگہ کافور کا ذکر ہے اور ایک جگہ زنجبیل کا۔ خدائیتعالیٰ کی یہ غرض ہے۔ کہ تا اپنے بندوں کو سمجھائے کہ جب انسان جذبات نفسانی سے نیکی کی طرف حرکت کرتا ہے۔ تو پہلے پہل اس حرکت کے بعد یہ حالت پیدا ہوتی ہے۔ کہ اس کے زہریلے مواد نیچے دبائے جاتے ہیں۔ اور نفسانی جذبات رُو بکمی ہونے لگتے ہیں۔ جیساکہ کافور زہریلے مواد کو دبا لیتا ہے۔ اسی لئے وہ ہیضہ اور محرقہ تپوں میں مفید ہے اور پھر جب زہریلے مواد کا جوش بالکل جاتا رہے گا۔ اور ایک کمزور صحت جو ضعف کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے۔ حاصل ہو جاتی ہے۔ پھر دوسرا مرحلہ یہ ہے۔ کہ وہ ضعیف بیمار زنجبیل کے شربت سے قوت پاتا ہے۔ اور زنجبیلی شربت خدائیتعالے کے حسن و جمال کی تجلی ہے۔ جو رُوح کی غذا ہے۔ جب اس تجلی سے انسان قوت پکڑتا ہے۔ تو پھر بلند اور اُونچی گھاٹیوں پر چڑھنے کے لائق ہو جاتا ہے اور خدائیتعالیٰ کی راہ میں ایسی حیرت ناک سختی کے کام دکھلاتا ہے کہ جب تک یہ عاشقانہ گرمی کسی کے دل میں نہ ہو۔ ہرگز ایسے کام دکھلا نہیں سکتا۔ سو خدا تعالےٰ نے اس جگہ ان دو حالتوں کے سمجھانے کے لئے عربی زبان کے دو لفظوں سے کام لیا ہے۔ ایک کافور جو نیچے دبانے والے کو کہتے ہیں۔ اور دوسرے زنجبیل جو اوپر چڑھنے والے کو کہتے ہیں۔ اور اس راہ میں یہی دو حالتیں سالکوں کے لئے واقع ہیں۔ باقی حصہ آیت کا یہ ہے۔ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ

سلٰسِلَ وَ اَغْلٰلًا وَّ سَعِیْرًا ۝ یعنی ہم نے منکروں کے لئے جو سچائی کو قبول کرنا نہیں چاہتے۔ زنجیریں طیار کر دی ہیں۔ اور طوق گردن اور ایک افروختہ آگ کی سوزش۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے۔ کہ جو لوگ سچے دل سے خدا تعالےٰ کو نہیں ڈھونڈتے۔ اُن پر خدا کی طرف سے رجعت پڑتی ہے۔ وہ دنیا کی گرفتاریوں میں ایسے مبتلا رہتے ہیں۔ کہ گویا پابہ زنجیر ہیں۔ اور زمینی کاموں میں ایسے نگونسار ہوتے ہیں۔ کہ گویا ان کی گردن میں ایک طوق ہے۔ جو ان کو آسمان کی طرف سر نہیں اٹھانے دیتا۔ اور انکے دلوں میں حرص و ہوا کی ایک سوزش لگی ہوئی ہوتی ہے کہ یہ مال حاصل ہو جائے۔ اور یہ جائداد مِل جائے۔ اور فلاں ملک ہمارے قبضہ میں آجائے۔ اور فلاں دشمن پر ہم فتح پا جائیں۔ اس قدر روپیہ ہو۔ اتنی دولت ہو۔ سو چونکہ خدا تعالیٰ ان کو نالائق دیکھتا ہے۔ اور بُرے کاموں میں مشغول پاتا ہے۔ اس لئے یہ تینوں بلائیں ان کو لگا دیتا ہے۔ اور اس جگہ اس بات کیطرف بھی اشارہ ہے۔ کہ جب انسان سے کوئی فعل صادر ہوتا ہے۔ تو اسی کے مطابق خدا بھی اپنی طرف سے ایک فعل صادر کرتا ہے۔ مثلاً انسان جس وقت اپنی کوٹھڑی کے تمام دروازوں کو بند کر دے۔ تو انسان کے اس فعل کے بعد خدا تعالیٰ کا یہ فعل ہو گا۔ کہ وہ اس کوٹھڑی میں اندھیرا پیدا کرے گا کیونکہ جو امور خدا تعالےٰ کے قانونِ قدرت میں ہمارے کاموں کے لئے بطور ایک نتیجہ لازمی کے مقدر ہو چکے ہیں۔ وہ سب خدا تعالےٰ کے فعل ہیں۔ وجہ یہ کہ وہی علّت العلل ہے۔ ایسا ہی اگر مثلاً کوئی شخص زہر قاتل کھا لے۔ تو اس کے اس فعل کے بعد خدا تعالیٰ کا یہ فعل صادر ہو گا۔ کہ اسے ہلاک کر دے گا۔ ایسا ہی اگر کوئی ایسا بے جا فعل کرے۔ جو کسی متعدی بیماری کا موجب ہو تو اس کے اس فعل کے بعد خدا تعالیٰ کا یہ فعل ہو گا کہ وہ متعدی بیماری اس کو پکڑ لے گی۔ پس جس طرح ہماری دنیوی زندگی میں صریح نظر آتا ہے۔ کہ ہمارے ہر ایک فعل کے لئے ایک ضروری نتیجہ ہے۔ اور وہ نتیجہ خدا تعالےٰ کا فعل ہے۔

انسان کے افعال پر خدا کا فعل مترتب ہے

ایسا ہی دین کے متعلق بھی یہی قانون ہے۔ جیسا کہ خدا تعالےٰ ان دو مثالوں میں صاف فرماتا ہے۔ اَلَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا۔ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ یعنی جو لوگ اس فعل کو بجا لائے۔ کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کی جستجو میں پوری پوری کوشش کی۔ تو اس فعل کے لئے لازمی طور پر ہمارا یہ فعل ہوگا۔ کہ ہم ان کو اپنی راہ دکھا دینگے۔ اور جن لوگوں نے کجی اختیار کی۔ اور سیدھی راہ پر چلنا نہ چاہا۔ تو ہمارا فعل ان کی نسبت یہ ہوگا۔ کہ ہم اُن کے دلوں کو کج کر دینگے۔ اور پھر اسی حالت کو زیادہ توضیح دینے کے لئے فرمایا۔ مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی وَاَضَلُّ سَبِیْلًا۔ یعنی جو شخص اس جہان میں اندھا رہا۔ وہ آنے والے جہان میں بھی اندھا ہی ہوگا۔ بلکہ اندھوں سے بدتر یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ نیک بندوں کو خدا کا دیدار اسی جہان میں ہو جاتا ہے۔ اور وہ اسی جگہ میں اپنے اس پیارے کا درشن پا لیتے ہیں۔ جس کے لئے وہ سب کچھ کھوتے ہیں۔ غرض مفہوم اس آیت کا یہی ہے کہ بہشتی زندگی کی بنیاد اسی جہان سے پڑتی ہے اور جہنمی نابینائی کی جڑھ بھی اسی جہان کی گندی اور کورانہ زیست ہے اور پھر فرمایا۔ وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ۔ یعنی جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہ اُن باغوں کے وارث ہیں جنکے نیچے نہریں بہ رہی ہیں

[illegible]

اس آیت میں خدا تعالےٰ نے ایمان کو باغ کے ساتھ مشابہت دی ہے۔ جس کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ پس واضح رہے کہ اس جگہ ایک اعلیٰ درجہ کی فلاسفی کے رنگ میں بتلایا گیا ہے کہ جو رشتہ نہروں کا باغ کے ساتھ ہے۔ وہی رشتہ اعمال کا ایمان کے ساتھ ہے۔ پس جیسا کہ کوئی باغ بغیر پانی کے سرسبز نہیں رہ سکتا ایسا ہی کوئی ایمان بغیر نیک کاموں کے زندہ ایمان نہیں کہلا سکتا۔ اگر ایمان ہو اور اعمال نہ ہوں۔ تو وہ ایمان ہیچ ہے۔ اور اگر اعمال ہوں۔ اور ایمان نہ ہو۔ تو وہ اعمال ریاکاری ہیں۔ اسلامی بہشت کی یہی حقیقت ہے۔ کہ وہ اس دنیا کے

ایمان اور عمل کا ایک ظل ہے۔ وہ کوئی نئی چیز نہیں۔ جو باہر سے آکر انسان کو ملے گی بلکہ انسان کی بہشت انسان کے اندر ہی سے نکلتی ہے۔ اور ہر ایک کی بہشت اسی کا ایمان اور اسی کے اعمال صالحہ ہیں۔ جن کی اسی دنیا میں لذت شروع ہو جاتی ہے۔ اور پوشیدہ طور پر ایمان اور اعمال کے باغ نظر آتے ہیں۔ اور نہریں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ لیکن عالم آخرت میں یہی باغ کھلے طور پر محسوس ہونگے۔ خداوند تعالیٰ کی پاک تعلیم ہمیں یہی بتلاتی ہے۔ کہ سچا اور پاک اور مستحکم اور کامل ایمان جو خدا اور اسکی صفات اور اسکے ارادوں کے متعلق ہو۔ وہ بہشت خوشنما اور بارور درخت ہے اور اعمال صالحہ اس بہشت کی نہریں ہیں۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ ۔ یعنی وہ ایمانی کلمہ جو ہر ایک افراط اور تفریط اور نقص اور خلل اور کذب اور ہزل سے پاک اور من کل الوجوہ کامل ہو۔ اس درخت کے ساتھ مشابہ ہے۔ جو ہر ایک عیب سے پاک ہو۔ جسکی جڑھ زمین میں قائم اور شاخیں آسمان میں ہوں اور اپنے پھل کو ہمیشہ دیتا ہو۔ اور کوئی وقت اس پر نہیں آتا۔ کہ اسکی شاخوں میں پھل نہ ہوں۔ اس بیان میں خدا تعالےٰ نے ایمانی کلمہ کو ہمیشہ پھلدار درخت سے مشابہت دیکر تین علامتیں اسکی بیان فرمائیں۔ (۱) اول یہ کہ جڑھ اس کی جو اصل مفہوم سے مراد ہے۔ انسان کے دل کی زمین میں ثابت ہو یعنی انسانی فطرت اور انسانی کانشنس نے اس کی حقانیت اور اصلیت کو قبول کر لیا ہو۔ (۲) دوسری علامت یہ کہ اس کلمہ کی شاخیں آسمان میں ہوں۔ یعنی معقولیت اپنے ساتھ رکھتا ہو۔ اور آسمانی قانون قدرت جو خدا کا فعل ہے اس فعل کے مطابق ہو۔ مطلب یہ کہ اسکی صحت اور اصلیت کے دلائل قانون قدرت سے مستنبط ہو سکتے ہوں۔ اور نیز یہ کہ وہ دلائل ایسے اعلیٰ ہوں۔ کہ گویا آسمان میں ہیں۔ جن تک اعتراض کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا۔ (۳) تیسری

علامت یہ ہے۔ کہ وہ پھل جو کھانے کے لائق ہے۔ دائمی اور غیر منقطع ہو۔
یعنی عملی مزاولت کے بعد اسکی برکات و تاثیرات ہمیشہ و ہر زمانہ میں مشہود
اور محسوس ہوتی ہوں یہ نہیں کہ کسی خاص زمانہ تک ظاہر ہو کر پھر آگے بند ہو
جائیں۔ اور پھر فرمایا۔ مَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ
مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ۔ یعنی کلمہ پلید اس درخت کے ساتھ مشابہ
ہے جو زمین سے اکھڑا ہوا ہو یعنی فطرت انسانی اس کو قبول نہیں کرتی۔ اور کسی
طور سے وہ قرار نہیں پکڑتا۔ نہ دلائل عقلیہ کی رو سے۔ نہ قانون قدرت کی رو سے
صرف قصہ اور کہانی کے رنگ میں ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ قرآن شریف نے عالم
آخرت میں ایمان کے پاک درختوں کو انگور اور عمدہ عمدہ میووں سے مشابہت
دی ہے۔ اور بیان فرمایا ہے کہ اس روز وہ ان میووں کی صورت میں متمثل ہونگے
اور دکھائی دینگے۔ ایسا ہی بے ایمانی کے خبیث درخت کا نام عالم آخرت میں
زقوم رکھا ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ أَذَٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ
إِنَّا جَعَلْنَاهَا فِتْنَةً لِّلظَّالِمِينَ ۝ إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ
طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ ۝ إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ طَعَامُ
الْأَثِيمِ كَالْمُهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ كَغَلْيِ الْحَمِيمِ ۝ ذُقْ إِنَّكَ
أَنتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ ۝ یعنی تم بتلاؤ۔ کہ بہشت کے باغ اچھے ہیں
یا زقوم کا درخت جو ظالموں کے لئے ایک بلا ہے۔ وہ ایک درخت
ہے۔ جو جہنم کی جڑھ میں سے نکلتا ہے۔ یعنی تکبر اور خود بینی سے پیدا
ہوتا ہے یہی دوزخ کی جڑھ ہے۔ اس کا شگوفہ ایسا ہے جیسا کہ شیطان
کا سر۔ شیطان کے معنے ہیں ہلاک ہونیوالا۔ یہ لفظ شیط سے نکلا ہے پس
حاصل کلام یہ ہے۔ کہ اس کا کھانا ہلاک ہوتا ہے۔ اور پھر فرمایا کہ زقوم
کا درخت ان دوزخیوں کا کھانا ہے۔ جو عمداً گناہ کو اختیار کر لیتے ہیں۔
وہ کھانا ایسا ہے۔ جیسا کہ تانبا گلا ہوا۔ کھولتے ہوئے پانی کی طرح پیٹ میں

قرآن میں بے ایمانوں کو زقوم [illegible]

جوش مارنے والا۔ پھر دوزخی کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔ کہ اس درخت کو چکھ تو عزت والا اور بزرگ ہے۔ یہ کلام نہایت غضب کا ہے۔ اس کا ماحصل یہ ہے۔ کہ اگر تو تکبر نہ کرتا۔ اور اپنی بزرگی اور عزت کا پاس کر کے حق سے منہ نہ پھیرتا۔ تو آج یہ تلخیاں تجھے اُٹھانی نہ پڑتیں۔ یہ آیت اس بات کی طرف اشارہ بھی کرتی ہے۔ کہ دراصل یہ لفظ زقوم کا "ذق" اور "ام" سے مرکب ہے اور "ام" اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ کا ملخص ہے۔ جس میں ایک حرف پہلے کا اور ایک حرف آخر کا موجود ہے۔ اور کثرت استعمال نے ذال کو ز اسکے ساتھ بدل دیا ہے اب حاصل کلام یہ ہے۔ کہ جیسا کہ اللہ تعالےٰ نے اسی دنیا کے ایمانی کلمات کو بہشت کے ساتھ مشابہت دی ہے۔ ایسا ہی اسی دنیا کے بے ایمانی کے کلمات کو زقوم کے ساتھ مشابہت دی۔ اور اس کو دوزخ کا درخت ٹھہرایا اور ظاہر فرما دیا۔ کہ بہشت اور دوزخ کی جڑھ اسی دنیا سے شروع ہوتی ہے جیسا کہ دوزخ کے باب میں ایک اور جگہ فرماتا ہے۔ نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْاَفْئِدَةِ۔ یعنی دوزخ وہ آگ ہے۔ جو خدا کا غضب اس کا منبع ہے۔ اور گناہ سے بھڑکتی ہے۔ اور پہلے دل پر غالب ہوتی ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ اس آگ کی اصل جڑھ وہ غم اور حسرتیں اور دردہیں جو دل کو پکڑتے ہیں۔ کیونکہ تمام روحانی عذاب پہلے دل سے ہی شروع ہوتے ہیں اور پھر تمام بدن پر محیط ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ایک جگہ فرمایا۔ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ۔ یعنی جہنم کی آگ کا ایندھن جس سے وہ آگ ہمیشہ افروختہ رہتی ہے دو چیزیں ہیں۔ ایک وہ انسان جو حقیقی خدا کو چھوڑ کر اور اور چیزوں کی پرستش کرتے ہیں۔ یا ان کی مرضی سے انکی پرستش کی جاتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔ اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ۔ یعنی تم اور تمہارے معبود باطل جو انسان ہو کر خدا کہلاتے رہے۔ جہنم میں ڈالے جائینگے (۲) دوسرا ایندھن جہنم کا بت ہیں مطلب یہ ہے۔ کہ ان چیزوں کا وجود نہ ہوتا۔ تو جہنم بھی نہ ہوتا۔ سو

ان تمام آیات میں ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ کے پاک کلام میں بہشت اور دوزخ اس جسمانی دنیا کی طرح نہیں ہے۔ بلکہ ان دونوں کا مبدا اور منبع روحانی امور ہیں ہاں وہ چیزیں دوسرے عالم میں جسمانی شکل پر نظر آئینگی۔ مگر اس جسمانی عالم سے نہیں ہونگی۔

خدا سے کامل روحانی تعلق کا ذریعہ

اب ہم پھر اصل مطلب کی طرف عود کرکے کہتے ہیں۔ کہ خدا کے ساتھ روحانی اور کامل تعلق پیدا ہونے کا ذریعہ جو قرآن شریف نے ہمیں سکھلایا ہے اسلام اور دعائے فاتحہ ہے یعنی اول اپنی زندگی خدا کی راہ میں وقف کر دینا۔ اور پھر اس دعا میں لگے رہنا۔ جو سورۂ فاتحہ میں مسلمانوں کو سکھائی گئی ہے۔ تمام اسلام کا مغز یہ دونوں چیزیں ہیں۔ اسلام اور دعائے فاتحہ دنیا میں خدا تک پہنچنے اور حقیقی نجات کا پانی پینے کے لئے یہی ایک اعلیٰ ذریعہ ہے۔ بلکہ یہی ایک ذریعہ ہے۔ جو قانونِ قدرت نے انسان کی اعلےٰ ترقی اور وصال الٰہی کے لئے مقرر کیا ہے۔ اور وہی خدا کو پاتے ہیں۔ کہ جو اسلام کے مفہوم کی روحانی آگ میں داخل ہوں۔ اور دعائے فاتحہ میں لگے رہیں اسلام کیا چیز ہے وہی جلتی ہوئی آگ جو ہماری سفلی زندگی کو بھسم کرکے اور ہمارے باطل معبودوں کو جلا کر سچے اور پاک معبود کے آگے ہماری جان اور ہمارے مال اور ہماری آبرو کی قربانی پیش کرتی ہے۔ ایسے چشمہ میں داخل ہو کر ہم ایک نئی زندگی کا پانی پیتے ہیں اور ہماری تمام روحانی قوتیں خدا سے یوں پیوند پکڑتی ہیں۔ جیسا کہ ایک رشتہ دوسرے رشتہ سے پیوند کیا جاتا ہے۔ بجلی کی آگ کی طرح ایک آگ

فنا اور بقا کا ذریعہ

ہمارے اندر سے نکلتی ہے اور ایک آگ اوپر سے ہم پر اترتی ہے۔ ان دونوں شعلوں کے ملنے سے ہماری تمام ہوا و ہوس اور غیر اللہ کی محبت بھسم ہو جاتی ہے۔ اور ہم اپنی پہلی زندگی سے مر جاتے ہیں۔ اس حالت کا نام قرآن شریف کے رو سے۔ اسلام ہے۔ اسلام سے ہمارے نفسانی جذبات کو موت آتی ہے۔ اور پھر دعا سے ہم از سر نو زندہ ہوتے ہیں۔ اس دوسری زندگی

کے لئے الہام الٰہی ہونا ضروری ہے۔ اسی مرتبہ پر پہنچنے کا نام لقاء الٰہی ہے
یعنی خدا کا دیدار اور خدا کا درشن ہے۔ اس درجہ پر پہنچ کر انسان کو خدا سے
وہ اتصال ہوتا ہے۔ کہ گویا وہ اس کو آنکھ سے دیکھتا ہے۔ اور اسکو قوت
دیجاتی ہے۔ اور اس کے تمام حواس اور تمام اندرونی قوتیں روشن کیجاتی ہیں
اور پاک زندگی کی کشش بڑے زور سے شروع ہو جاتی ہے۔ اسی درجہ پر
آکر خدا انسان کی آنکھ ہو جاتا ہے جسکے ساتھ وہ دیکھتا ہے۔ اور زبان ہو
جاتا ہے جسکے ساتھ وہ بولتا ہے۔ اور ہاتھ ہو جاتا ہے جسکے ساتھ وہ حملہ کرتا
ہے۔ اور کان ہو جاتا ہے جسکے ساتھ وہ سنتا ہے۔ اسی درجہ کی طرف اشارہ ہے
جو خدا تعالیٰ فرماتا ہے یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ۔ یہ اس کا ہاتھ خدا تعالےٰ
کا ہاتھ ہے۔ جو ان کے ہاتھوں پر ہے۔ اور ایسا ہی فرماتا ہے۔ وَمَا رَمَیْتَ
اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ یعنی جو تو نے چلایا۔ تو نے نہیں بلکہ خدا تعالےٰ نے
چلایا۔ غرض اس درجہ پر خدا تعالیٰ کے ساتھ کمال اتحاد ہو جاتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ
کی پاک مرضی روح کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتی ہے۔ اور اخلاقی طاقتیں
جو کمزور تھیں۔ اس درجہ میں محکم پہاڑوں کی طرح نظر آتی ہیں عقل اور فراست
نہایت لطافت پر آجاتی ہے۔ یہ معنی اس آیت کے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے
وَاَیَّدَھُمْ بِرُوْحٍ مِّنْہُ۔ اس مرتبہ میں محبت اور عشق کی نہریں ایسے طور سے
جوش مارتی ہیں۔ جو خدا تعالےٰ کے لئے مرنا اور خدا تعالےٰ کے لئے ہزاروں دکھ
اٹھانا اور بے آبرو ہونا ایسا آسان ہو جاتا ہے کہ گویا ایک ہلکا سا تنکا توڑنا
ہے۔ خدا تعالیٰ کی طرف کھینچا چلا جاتا ہے۔ اور نہیں جانتا کہ کون کھینچ رہا ہے ایک
غیبی ہاتھ اس کو اٹھائے پھرتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ کی مرضیوں کو پورا کرنا اس کی
زندگی کا اصل الاصول ٹھہر جاتا ہے۔ اس مرتبہ میں خدا بہت ہی قریب دکھائی
دیتا ہے۔ جیسا کہ اس نے فرمایا ہے۔ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ۔
یعنے ہم اس سے اسکی رگِ جان سے بھی زیادہ نزدیک ہیں۔ ایسی حالت میں اس

مرتبہ کا آدمی ایسا ہوتا ہے۔ کہ جس طرح پھل پختہ ہوکر خود بخود درخت پر سے گر جاتا ہے اسی طرح اس مرتبہ کے آدمی کے تمام تعلقات سفلی کالعدم ہو جاتے ہیں۔ اس کا اپنے خدا تعالےٰ سے ایک گہرا تعلق ہو جاتا ہے اور وہ مخلوق سے دُور چلا جاتا۔ اور خدا تعالےٰ کے مکالمات اور مخاطبات سے شرف پاتا ہے۔ اس مرتبہ کے حاصل کرنے کے لیئے اب بھی دروازے کھلے ہیں جیسے کہ پہلے کھلے ہوئے تھے اور اب بھی خدا یہ فضل نعمت ڈھونڈنے والوں کو دیتا ہے۔ جیسا کہ پہلے دیتا تھا۔ مگر یہ راہ محض زبان کی فضولیوں کے ساتھ حاصل نہیں ہوتی اور فقط بے حقیقت باتوں اور لافوں سے یہ دروازہ نہیں کھلتا۔ چاہنے والے بہت ہیں مگر پانے والے کم۔ اس کا کیا سبب ہے۔ یہی ہے۔ کہ یہ مرتبہ سچی گرمی سچی جانفشانی پر موقوف ہے۔ باتیں قیامت تک کیا کرو۔ کیا ہو سکتا ہے صدق سے آگ پر قدم رکھنا جس کے خوف سے اور لوگ بھاگتے ہیں۔ اس راہ کی پہلی شرط ہے۔ اگر عملی سرگرمی نہیں۔ تو لاف زنی ہیچ ہے۔ وَ اِذَا سَأَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ۝ پ ۲۔ یعنی اگر میرے بندے میری نسبت سوال کریں کہ وہ کہاں ہے۔ تو ان کو کہہ کہ وہ تم سے بہت ہی قریب ہے۔ میں دعا کرنے والے کی دعا سنتا ہوں۔ پس چاہیئے۔ کہ وہ دعاؤں سے میرا وصل ڈھونڈیں۔ اور مجھ پر ایمان لاویں۔ تا کامیاب ہوویں +

(حاشیہ: وصول الی اللہ کا ذریعہ)

موت کے بعد انسان کی کیا حالت ہوتی ہے

سو اس سوال کے جواب میں یہ گذارش ہے۔ کہ موت کے بعد جو کچھ انسان کی حالت ہوتی ہے۔ در حقیقت وہ کوئی نئی حالت نہیں ہوتی۔ بلکہ وہی دنیا کی

زندگی کی حالت زیادہ صفائی سے کھل جاتی ہے۔ جو کچھ انسان کے عقائد اور اعمال کی کیفیت صالح یا غیر صالح ہوتی ہے۔ وہ اس جہان میں مخفی طور پر اس کے اندر ہوتی ہے۔ اور اس کا تریاق یا زہر ایک چھپی ہوئی تاثیر انسانی وجود پر ڈالتا ہے مگر آنے والے جہان میں ایسا نہیں رہے گا۔ بلکہ تمام کیفیات کھلا کھلا اپنا چہرہ دکھلائینگی۔ اس کا نمونہ عالم خواب میں پایا جاتا ہے۔ کہ انسان کے بدن پر جس قسم کے مواد غالب ہوتے ہیں۔ عالم خواب میں اسی قسم کی جسمانی حالتیں نظر آتی ہیں۔ جب کوئی تیز تپ چڑھنے کو ہوتا ہے۔ تو خواب میں اکثر آگ اور آگ کے شعلے نظر آتے ہیں۔ اور بلغمی تپوں اور ریزش اور زکام کے غلبہ میں انسان اپنے تئیں پانی میں دیکھتا ہے۔ غرض جس طرح کی بیماریوں کے لئے بدن نے طیاری کی ہو۔ وہ کیفیتیں تمثل کے طور پر خواب میں نظر آجاتی ہیں۔ پس خواب کے سلسلہ پر غور کرنے سے ہر ایک انسان سمجھ سکتا ہے کہ عالم ثانی میں بھی یہی سنت اللہ ہے۔ کیونکہ جس طرح خواب ہم میں ایک خاص تبدیلی پیدا کر کے روحانیت کو جسمانی طور پر تبدیل کر کے دکھلاتا ہے۔ اس عالم میں بھی یہی ہوگا۔ اور اس دن ہمارے اعمال اور اعمال کے نتائج جسمانی طور پر ظاہر ہونگے اور جو کچھ ہم اس عالم سے مخفی طور پر ساتھ لے جائینگے۔ وہ سب اس دن ہمارے چہرہ پر نمودار نظر آئے گا۔ اور جیسا کہ انسان جو کچھ خواب میں طرح طرح کے تمثلات دیکھتا ہے۔ اور کبھی گمان نہیں کرتا۔ کہ یہ تمثلات ہیں۔ بلکہ انہیں واقعی چیزیں یقین کرتا ہے۔ ایسا ہی اس عالم میں ہوگا۔ بلکہ خدا تعالےٰ تمثلات کے ذریعہ سے اپنی نئی قدرت دکھائے گا۔ چونکہ وہ قدرت کامل ہے پس اگر ہم تمثلات کا نام بھی نہ لیں۔ اور یہ کہیں۔ کہ خدا کی قدرت سے وہ ایک نئی پیدائش ہے۔ تو یہ تقریر بہت درست اور واقعی اور صحیح ہے۔ خدا تعالےٰ فرماتا ہے۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ۔ یعنی کوئی نفس نیکی کرنے والا نہیں جانتا۔ کہ وہ کیا کیا نعمتیں ہیں۔ جو اس کے لئے مخفی

خواب اگلے جہان کے سمجھنے کا ذریعہ ہی

ہیں۔ سو خدا تعالےٰ نے ان تمام نعمتوں کو مخفی قرار دیا۔ جن کا دنیا کی نعمتوں میں نمونہ نہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دنیا کی نعمتیں ہم پر مخفی نہیں ہیں۔ اور ہم دودھ اور انار اور انگور وغیرہ جانتے ہیں۔ اور ہمیشہ یہ چیزیں کھاتے ہیں۔ سو اس سے معلوم ہوا۔ کہ وہ چیزیں اور ہیں۔ اور ان کو ان چیزوں سے صرف نام کا اشتراک ہے۔ پس جس نے بہشت کو دنیا کی چیزوں کا مجموعہ سمجھا۔ اُس نے قرآن شریف کا ایک حرف بھی نہیں سمجھا۔ اس آیت کی شرح میں جو ابھی لکھی گئی ہے۔ ہمارے سید و مولیٰ نبی صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ کہ بہشت اور اس کی نعمتیں وہ چیزیں ہیں۔ جو نہ کبھی کسی آنکھ نے دیکھیں۔ اور نہ کسی کان نے سنیں۔ اور نہ دلوں میں کبھی گذریں حالانکہ ہم دنیا کی نعمتوں کو آنکھوں سے بھی دیکھتے ہیں۔ اور کانوں سے بھی سُنتے ہیں۔ اور دل میں بھی وہ نعمتیں گذرتی ہیں پس جبکہ خدا تعالیٰ اور رسول اس کا ان چیزوں کو ایک نرالی چیزیں بتلاتا ہے۔ تو ہم قرآن سے دُور جا پڑتے ہیں۔ اگر یہ گمان کریں۔ کہ بہشت میں بھی دنیا کا ہی دودھ ہوگا۔ کہ گایوں اور بھینسوں سے دوہا جاتا ہے۔ گویا دودھ دینے والے جانوروں کے وہاں ریوڑ کے ریوڑ موجود ہونگے۔ اور درختوں پر شہد کی مکھیوں نے بہت سے چھتے لگائے ہوئے ہونگے اور فرشتے تلاش کر کے وہ شہد نکالینگے۔ اور نہروں میں ڈالینگے۔ کیا ایسے خیالات اس تعلیم سے کچھ مناسبت رکھتے ہیں جس میں یہ آیتیں موجود ہیں۔ کہ دنیا نے ان چیزوں کو کبھی نہیں دیکھا۔ اور وہ چیزیں روح کو روشن کرتی ہیں۔ اور خدا کی معرفت بڑھاتی ہیں۔ اور روحانی غذائیں ہیں۔ گو ان غذاؤں کا تمام نقشہ جسمانی رنگ پر ظاہر کیا گیا ہے۔ مگر ساتھ ساتھ بتایا گیا ہے۔ کہ ان کا سرچشمہ رُوح اور راستی ہے۔ کوئی یہ گمان نہ کرے۔ کہ قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت سے یہ پایا جاتا ہے کہ جو جو نعمتیں بہشت میں دی جائیں گی۔ ان نعمتوں کو دیکھ کر بہشتی لوگ ان کو شناخت

بہشتی نعمتیں مخفی

کر لینگے۔ کہ یہی نعمتیں ہمیں پہلے بھی ملی تھیں۔ جیسا کہ اللہ جلّشانہ فرماتا ہے وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۭ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا ھٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا۔ یعنی جو لوگ ایمان لانے والے اور اچھے کام کرنے والے ہیں جن میں ذرہ فساد نہیں۔ ان کو خوشخبری دے کہ وہ اس بہشت کے وارث ہیں جسکے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ جب وہ عالم آخرت میں ان درختوں کے ان پھلوں میں سے جو دنیا کی زندگی میں ہی ان کو مل چکے تھے۔ پائینگے۔ تو کہیں گے۔ کہ یہ تو وہ پھل ہیں۔ جو ہمیں پہلے ہی دیئے گئے تھے۔ کیونکہ وہ ان پھلوں کو ان پہلے پھلوں سے مشابہ پائیں گے۔ اب یہ گمان کہ پہلے پھلوں سے مراد دنیا کی جسمانی نعمتیں ہیں۔ بالکل غلطی ہے۔ اور آیت کے بدیہی معنی اور اس کے منطوق کے بالکل برخلاف ہے۔ بلکہ اللہ جل شانہ اس آیت میں یہ فرماتا ہے کہ جو لوگ ایمان لائے۔ اور اعمال صالح کئے۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے ایک بہشت بنایا ہے جسکے درخت ایمان اور نہریں جس کی اعمال صالحہ ہیں۔ اسی بہشت کا وہ آیندہ بھی پھل کھائیں گے اور وہ پھل زیادہ نمایاں اور شیریں ہوگا۔ اور چونکہ وہ روحانی طور پر اسی پھل کو دنیا میں کھاچکے ہونگے۔ اس لئے دوسری دنیا میں اس پھل کو پہچان لینگے اور کہیں گے۔ کہ یہ تو پھل وہی معلوم ہوتے ہیں۔ کہ جو پہلے ہمارے کھانے میں آچکے ہیں اور اس پھل کو اس پہلی خوراک سے مشابہ پائینگے۔ سو یہ آیت صریح بتا رہی ہے کہ جو لوگ دنیا میں خدا کی محبت اور پیار کی غذا کھاتے ہیں۔ اب جسمانی شکل پر وہی غذا ان کو ملے گی اور چونکہ وہ ربت اور محبت کا مزہ چکھ چکے تھے اور اس کیفیت سے آگاہ تھے۔ اس لئے ان کی روح کو وہ زمانہ یاد آجائیگا کہ جب وہ گوشوں اور خلوتوں میں اور رات کے اندھیروں میں محبت کے ساتھ اپنے محبوب حقیقی کو یاد کرتے اور اس یاد سے لذت اٹھاتے تھے۔ غرض اس جگہ

جسمانی غذاؤں کا کچھ ذکر نہیں۔ اور اگر کسی کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ جبکہ روحانی طور پر عارفوں کو یہ غذا دنیا میں مل چکی تھی۔ تو پھر یہ کہنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے۔ کہ وہ ایسی نعمتیں ہیں کہ نہ دنیا میں کسی نے دیکھیں نہ سنیں اور نہ کسی کے دل میں گذریں اور اس صورت میں دونوں آیتوں میں تناقض پایا جاتا ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ تناقض اس صورت میں ہوتا ہے کہ جب اس آیت میں دنیا کی نعمتیں مراد ہوتیں۔ لیکن اس جگہ دنیا کی نعمتیں مراد نہیں ہیں۔ جو کچھ عارف کو معرفت کے رنگ میں ملتا ہے وہ در حقیقت دوسرے جہان کی نعمت ہوتی ہے۔ جس کا نمونہ شوق دلانے کے لئے پہلے ہی دیا جاتا ہے یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ با خدا آدمی دنیا میں سے نہیں ہوتا۔ اسی لئے تو دنیا اُس سے بغض رکھتی ہے۔ بلکہ وہ آسمان سے ہوتا ہے۔ اس لئے آسمانی نعمت اس کو ملتی ہے۔ دنیا کا آدمی دنیا کی نعمتیں پاتا ہے اور آسمان کا آسمانی نعمتیں حاصل کرتا ہے۔ سو یہ بالکل سچ ہے کہ وہ نعمتیں دنیا کے کانوں اور دنیا کے دلوں اور دنیا کی آنکھوں سے چھپائی گئیں۔ لیکن جس کی دنیوی زندگی پر موت آجائے۔ اور وہ پیالہ رُوحانی طور پر اس کو پلایا جائے۔ جو آگے جسمانی طور پر پیا جائے گا۔ اُس کو یہ پیا اُس وقت یاد آجائے گا۔ جبکہ وہی پیالہ جسمانی طور پر اُس کو دیا جائے گا۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ وہ اس نعمت سے دنیا کی آنکھ اور کان وغیرہ کو بے خبر سمجھیگا۔ چونکہ وہ دنیا میں تھا۔ اگرچہ دنیا میں سے نہیں تھا۔ اس لئے وہ بھی گواہی دیگا۔ کہ دُنیا کی نعمتوں سے وہ نعمت نہیں ہے۔ نہ دنیا میں اس کی آنکھ نے ایسی نعمت دیکھی نہ کان نے سُنی۔ اور نہ دل میں گذری۔ لیکن دوسری زندگی میں اس کے نمونے دیکھے۔ جو دنیا میں سے نہیں تھے۔ بلکہ وہ آنے والے جہان کی ایک خبر تھی۔ اور اسی سے اس کا رشتہ اور تعلق تھا۔ دنیا سے کچھ تعلق نہ تھا۔ اب قاعدہ کلی کے طور پر یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے۔ کہ موت کے بعد جو حالتیں پیش آتی

ہیں۔ قرآن شریف نے انہیں تین قسم پر منقسم کیا ہے۔ اور عالم معاد کے متعلق
یہ تین قرآنی معارف ہیں۔ جن کو ہم جُدا جُدا اس جگہ ذکر کرتے ہیں +

پہلا دقیقہ معرفت۔ اوّل یہ دقیقہ معرفت ہے۔ کہ قرآن شریف بار
بار یہی فرماتا ہے۔ کہ عالمِ آخرت کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ بلکہ اُس کے تمام نظارے
اسی دُنیوی زندگی کے اظلال و آثار ہیں۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔ وَكُلَّ اِنْسَانٍ
اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ
مَنْشُوْرًا ٥ پ۱۵ یعنی ہم نے اسی دُنیا میں ہر ایک شخص کے اعمال کا اثر اس کی
گردن سے باندھ رکھا ہے۔ اور انہیں پوشیدہ اثروں کو ہم قیامت کے دن
ظاہر کر دینگے۔ اور ایک کھلے کھلے اعمالنامہ کی شکل پر دکھلا دینگے۔ اس آیت میں
جو طائر کا لفظ ہے۔ تو واضح ہو کہ طائر اصل میں پرندہ کو کہتے ہیں۔ پھر استعارہ کے
طور پر اس سے مراد عمل بھی لیا گیا ہے۔ کیونکہ ہر ایک عمل نیک ہو یا بد ہو۔ وہ
وقوع کے بعد پرندہ کی طرح پرواز کر جاتا ہے۔ اور مشقت یا لذت اسکی کالعدم
ہو جاتی ہے اور دل پر اسکی کثافت یا لطافت باقی رہ جاتی ہے۔ یہ قرآنی اصول
ہے۔ کہ ہر ایک عمل پوشیدہ طور پر اپنے نقوش جماتا ہے۔ جس طور کا انسان کا فعل
ہوتا ہے۔ اس کے مناسب حال ایک خدا تعالےٰ کا فعل صادر ہوتا ہے۔ اور
وہ فعل اس گناہ کو یا نیکی کو ضائع ہونے نہیں دیتا۔ بلکہ اس کے نقوش دل پر
مُنہ پر آنکھوں پر کانوں پر ہاتھوں پر پیروں پر لکھے جاتے ہیں۔ اور یہی پوشیدہ
طور پر ایک اعمالنامہ ہے۔ جو دوسری زندگی میں کھلے طور پر ظاہر ہو جائے گا
اور پھر ایک دوسری جگہ بہشتیوں کے بارے میں فرماتا ہے۔ يَوْمَ تَرَى
الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ
یعنی اس دن بھی ایمانی نور جو پوشیدہ طور پر مومنوں کو حاصل ہے کھلے کھلے طور
پر اُن کے آگے اور اُن کے داہنے ہاتھ پر دوڑتا نظر آئے گا۔ پھر ایک اور جگہ
بدکاروں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے۔ اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ

كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ط كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ
الْيَقِيْنِ ہ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ ثُمَّ
لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ہ یعنی دُنیا کی کثرت حرص و ہوا نے تمہیں
آخرت کی تلاش سے روک رکھا۔ یہاں تک کہ تم قبروں میں جا پڑے۔ دنیا سے
دل مت لگاؤ۔ تم عنقریب جان لوگے۔ کہ دنیا سے دل لگانا اچھا نہیں۔ پھر
میں کہتا ہوں۔ کہ عنقریب تم جان لوگے۔ کہ دنیا سے دل لگانا اچھا نہیں۔ اگر
تمہیں یقینی علم حاصل ہو تو تم دوزخ کو اسی دنیا میں دیکھ لوگے۔ پھر برزخ کے
عالم میں یقین کی آنکھوں کے ساتھ دیکھوگے۔ پھر عالم حشر اجساد میں پورے
مواخذہ میں آجاؤگے۔ اور وہ عذاب تم پر کامل طور پر وارد ہو جائیگا۔ اور
صرف قال سے نہیں بلکہ حال سے تمہیں دوزخ کا علم حاصل ہو جائیگا۔ ان
آیات میں اللہ تعالےٰ نے صاف فرمایا ہے۔ کہ اسی جہان میں بدکاروں کے
لئے جہنمی زندگی پوشیدہ طور پر ہوتی ہے۔ اور اگر غور کریں۔ تو اپنے دوزخ
کو اسی دنیا میں دیکھ لینگے۔ اور اس جگہ اللہ تعالےٰ نے علم کو تین درجوں پر
منقسم کیا ہے۔ یعنی **علم الیقین۔ عین الیقین۔ حق الیقین**۔ اور
عام کے سمجھنے کے لئے ان تینوں علموں کی یہ مثالیں ہیں۔ کہ اگر مثلاً ایک شخص
دُور سے کسی جگہ بہت سا دُھواں دیکھے۔ اور پھر دھوئیں سے ذہن منتقل

یقین کے تین درجات کا بیان

ہو کر آگ کی طرف چلا جائے۔ اور آگ کے وجود کا یقین کرے۔ اور اس
خیال سے کہ دھوئیں اور آگ میں ایک تعلق لاینفک اور ملازمت تامہ
ہے۔ جہاں دُھواں ہوگا۔ ضرور ہے۔ کہ آگ بھی ہو۔ پس اس علم کا نام
علم الیقین ہے۔ اور پھر جب آگ کے شعلے دیکھ لے۔ تو اس علم کا نام
عین الیقین ہے۔ اور جب اس آگ میں آپ ہی داخل ہو جائے۔ تو
اس علم کا نام حق الیقین ہے۔ اب اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ کہ جہنم کے وجود
کا علم الیقین تو اسی دنیا میں ہو سکتا ہے۔ تو پھر عالم برزخ میں عین الیقین

حاصل ہوگا۔ اور عالم حشر اجساد میں وہی علم حق الیقین کے کامل مرتبہ تک پہنچیگا
اس جگہ واضح رہے۔ کہ قرآنی تعلیم کی رُو سے تین عالم ثابت ہوتے ہیں۔ اول دُنیا۔ جس کا نام عالم کسب اور نشاء اولے ہے۔ اسی دنیا میں انسان اکتساب نیکی یا بدی کا کرتا ہے۔ اور اگرچہ عالم بعث میں نیکوں کے واسطے ترقیات ہیں۔ مگر وہ محض خدا کے فضل سے ہیں۔ انسان کے کسب کو ان میں دخل نہیں (۲) اور دوسرے عالم کا نام برزخ ہے۔ اصل میں لفظ برزخ لغت عرب میں اس چیز کو کہتے ہیں۔ کہ جو دو چیزوں کے درمیان واقع ہو۔ سو چونکہ یہ زمانہ عالم بعثت اور عالم نشاء اولے میں واقع ہے۔ اس لئے اس کا نام عالم برزخ ہے۔ لیکن یہ لفظ قدیم سے اور جب سے دنیا کی بنا پڑی عالم درمیانی پر بولا گیا ہے۔ اس لئے اس لفظ میں عالم درمیانی کے وجود پر ایک عظیم الشان شہادت مخفی ہے۔

لفظ برزخ کی لطیف تشریح

ہم منن الرحمٰن میں ثابت کر چکے ہیں۔ کہ عربی کے الفاظ وہ الفاظ ہیں۔ جو خدا کے مُنہ سے نکلے ہیں۔ اور دنیا میں فقط یہی ایک زبان ہے۔ جو خدا تعالےٰ کی زبان اور قدیم اور تمام علوم کا سرچشمہ اور تمام زبانوں کی ماں اور خدا کی وحی کا پہلا اور پچھلا تخت گاہ ہے۔ خدا کی وحی کا پہلا تخت گاہ اس لئے کہ تمام عربی خدا کا کلام تھا۔ جو قدیم سے خدا کے ساتھ تھا۔ پھر وہی کلام دنیا میں اُترا۔ اور دنیا نے اس سے اپنی بولیاں بنائیں۔ اور آخری تخت گاہ خدا کا اس لئے لغت عربی ٹھہری۔ کہ آخری کتاب خدا تعالےٰ کی جو قرآن شریف ہے عربی میں نازل ہوئی۔ سو برزخ عربی لفظ ہے جو مرکب ہے بَرْ اور زَخْ سے جس کے یہ معنی ہیں۔ کہ طریق کسب اعمال ختم ہو گیا۔ اور ایک مخفی حالت میں پڑ گیا برزخ کی حالت وہ حالت ہے کہ جب یہ ناپائدار ترکیب انسانی تفرق پذیر ہو جاتی ہے۔ اور رُوح الگ اور جسم الگ ہو جاتا ہے۔ اور جیسا کہ دیکھا گیا ہے جسم کسی گڑھے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اور رُوح بھی ایک قسم کے گڑھے میں پڑ جاتی

ہے۔ جس میں لفظ نسخ کا دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ وہ افعال کسب خیر یا شر پر قادر نہیں ہو سکتے۔ کہ جو جسم کے تعلقات سے اس سے صادر ہو سکتے تھے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ہماری رُوح کی عمدہ صحت جسم پر موقوف ہے۔ دماغ کے ایک خاص حصّہ پر چوٹ لگنے سے حافظہ جاتا رہتا ہے۔ اور دوسرے حصّہ پر آفت پہنچنے سے قوت متفکّرہ رخصت ہوتی ہے۔ اور تمام ہوش و حواس رخصت ہو جاتے ہیں۔ اور دماغ میں اب کسی قسم کا تشنج ہو جائے۔ یا ورم پیدا ہو یا خون یا کوئی اور مادہ ٹھہر جائے۔ اور کسی سُدّہ تام یا غیر تام کو پیدا کرے۔ تو غشی یا مرگی یا سکتہ معاً لاحق حال ہو جاتا ہے۔ پس ہمارا قدیم کا تجربہ ہمیں یقینی طور پر سکھلاتا ہے کہ ہماری رُوح بغیر تعلّق جسم کے بالکل نکمّی ہے۔ سو یہ بات بالکل باطل ہے۔ کہ

روح کے لئے جسم ضروری ہے

ہم ایسا خیال کریں کہ کسی وقت میں ہماری مجرّد روح جسکے ساتھ جسم نہیں ہے کسی خوشحالی کو پا سکتی ہے۔ اگر ہم قصہ کے طور پر اس کو قبول کریں۔ تو کریں۔ لیکن معقولی طور پر اس کے ساتھ کوئی دلیل نہیں۔ ہم بالکل سمجھ نہیں سکتے۔ کہ وہ ہماری رُوح جو جسم کے ادنٰے ادنٰے خلل کے وقت بیکار ہو کر بیٹھ جاتی ہے۔ وہ اُس روز کیونکر کامل حالت پر رہے گی۔ جبکہ بالکل جسم کے تعلقات سے محروم کی جائیگی۔ کیا ہر روز ہمیں تجربہ نہیں سمجھاتا۔ کہ رُوح کی صحت کیلئے جسم کی صحت ضروری ہے۔ جب ایک شخص ہم میں سے پیر فرتوت ہو جاتا ہے۔ تو ساتھ ہی اسکی رُوح بھی بوڑھی ہو جاتی ہے۔ اس کا تمام علمی سرمایہ بڑھاپے کا چور چرا کر لے جاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ جلشانہ فرماتا ہے۔ لِکَیْلَا یَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَیْئًا۔ یعنی انسان بڈھا ہو کر ایسی حالت تک پہنچ جاتا ہے۔ کہ پڑھ پڑھا کر پھر جاہل بن جاتا ہے۔ پس ہمارا یہ تمام مشاہدہ اس بات پر کافی دلیل ہے کہ رُوح بغیر جسم کے کچھ چیز نہیں۔ پھر یہ خیال بھی انسان کو حقیقی سچائی کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ کہ اگر روح بغیر جسم کے کچھ چیز ہوتی۔ تو خدا تعالیٰ کا یہ کام لغو ٹھہرتا۔ کہ اس کو خواہ نخواہ جسم فانی سے پیوند دے دیتا۔ اور پھر یہ بھی سوچنے کے لائق ہے کہ

[illegible]

خدا تعالےٰ نے انسان کو غیر متناہی ترقیات کے لئے پیدا کیا ہے پس جس حالت میں انسان اس مختصر زندگی کی ترقیات کو بغیر رفاقت جسم کے حاصل نہیں کر سکا۔ تو کیونکر امید رکھیں کہ ان نامتناہی ترقیات کو جو ناپیدا کنار ہیں۔ بغیر رفاقت جسم کے خود بخود حاصل کر لے گا۔ سو ان تمام دلائل سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ رُوح کے افعال کاملہ صادر ہونے کے لئے اسلامی اصول کے رو سے جسم کی رفاقت رُوح کے ساتھ دائمی ہے۔ گو موت کے بعد یہ فانی جسم روح سے الگ ہو جاتا ہے۔ مگر عالمِ برزخ میں مستعار طور پر ہر ایک روح کو کسی قدر اپنے اعمال کا مزہ چکھنے کے لئے جسم ملتا ہے وہ جسم اس جسم کی قسم میں نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک نور سے یا ایک تاریکی سے جیسا اعمال کی صورت ہو۔ جسم طیار ہوتا ہے۔ گویا کہ اس عالم میں انسان کی عملی حالتیں جسم کا کام دیتی ہیں۔ ایسا ہی خدا کے کلام میں بار بار ذکر آیا ہے۔ اور بعض جسم نورانی اور بعض جسم ظلمانی قرار دیئے ہیں۔ جو اعمال کی روشنی یا اعمال کی ظلمت سے طیار ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ راز ایک نہایت دقیق راز ہے۔ مگر غیر معقول نہیں۔ انسان کامل اسی زندگی میں ایک نورانی وجود اس کیفیت جسم کے علاوہ پا سکتا ہے۔ اور عالمِ مکاشفات میں اسکی بہت مثالیں ہیں۔ اگرچہ ایسے شخص کو سمجھانا مشکل ہوتا ہے۔ جو صرف ایک موٹی عقل کی حد تک ٹھہرا ہوا ہے لیکن جن کو عالمِ مکاشفات میں سے کچھ حصّہ ہے وہ اس قسم کے جسم کو جو اعمال سے طیار ہوتا ہے۔ تعجب اور استبعاد کی نگاہ سے نہیں دیکھیں گے۔ بلکہ اس مضمون سے لذت اُٹھائینگے۔ غرض یہ جسم جو اعمال کی کیفیت سے ملتا ہے۔ یہی عالمِ برزخ میں نیک و بد کی جزا کا موجب ہو جاتا ہے۔ میں اس میں صاحبِ تجربہ ہوں۔ مجھے کشفی طور پر عین بیداری میں بارہا بعض مُردوں کی ملاقات کا اتفاق ہوا ہے۔ اور میں نے بعض فاسقوں اور گمراہی اختیار کرنے والوں کا جسم ایسا سیاہ دیکھا ہے۔ کہ گویا وہ دھوئیں سے بنایا گیا ہے۔ غرض میں اس کوچہ سے ذاتی واقفیت رکھتا ہوں اور میں زور سے کہتا ہوں

کہ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے ایسا ہی ضرور مرنے کے بعد ہر ایک کو
ایک جسم ملتا ہے۔ خواہ نورانی خواہ ظلمانی۔ انسان کی یہ غلطی ہوگی۔ اگر
وہ ان نہایت باریک معارف کو صرف عقل کے ذریعہ سے ثابت کرنا
چاہے۔ بلکہ جاننا چاہیئے۔ کہ جیسا کہ آنکھ شیریں چیز کا مزا نہیں بتلا سکتی
اور نہ زبان کسی چیز کو دیکھ سکتی ہے۔ ایسا ہی وہ علوم معاد جو پاک
مکاشفات سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ صرف عقل کے ذریعہ سے ان کا عقدہ حل
نہیں ہو سکتا۔ خدا تعالیٰ نے اس دنیا میں مجہولات کے جاننے کے لئے
علیحدہ علیحدہ وسائل رکھے ہیں۔ پس ہر ایک چیز کو اس کے وسیلہ کے
ذریعہ سے ڈھونڈو۔ تب اسے پالو گے۔ ایک اور بات بھی یاد رکھنے کے
لائق ہے کہ خدا نے ان لوگوں کو جو بدکاری اور گمراہی میں پڑ گئے۔ اپنے کلام
میں مردہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اور نیکوکاروں کو زندہ قرار دیا
ہے۔ اس میں بھید یہ ہے کہ جو لوگ خدا تعالیٰ سے غافل مرے۔ ان کی
زندگی کے اسباب جو کھانا پینا اور شہوتوں کی پیروی تھی منقطع ہو گئے۔ اور
روحانی غذا میں ان کو کچھ حصہ نہ تھا۔ پس وہ درحقیقت مر گئے۔ اور وہ صرف
عذاب اٹھانے کے لئے زندہ ہونگے۔ اسی بھید کی طرف اللہ جلّ شانہ نے ارشاد
فرمایا ہے۔ جیسا کہ کہتا ہے۔ وَمَنْ يَّأْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ لَا
يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى۔ یعنی جو شخص مجرم بن کر خدا کے پاس آئے گا۔ تو اس کا
ٹھکانا جہنم ہے وہ اس میں نہ مریگا۔ اور نہ زندہ رہے گا۔ مگر جو لوگ خدا تعالیٰ کے
محب ہیں۔ وہ موت سے نہیں مرتے۔ کیونکہ ان کا پانی اور ان کی روٹی انکے ساتھ
ہوتی ہے۔ پھر برزخ کے بعد وہ زمانہ ہے۔ جس کا نام عالم بعث ہے۔ اس زمانہ میں
ہر ایک روح نیک ہو یا بد۔ صالح ہو یا فاسق۔ ایک کھلا کھلا جسم حاصل کرے گی
اور یہ دن خدا کی ان پوری تجلیات کے لئے مقرر کیا گیا ہے۔ جس میں ہر ایک انسان
اپنے رب کی ہستی سے پورے طور پر واقف ہو جائے گا۔ اور ہر ایک شخص اپنے

[illegible]

[illegible]

جزا کے انتہائی نقطہ تک پہنچے گا۔ یہ تعجب نہیں کرنا چاہیئے۔ کہ خدا سے یہ کیونکر ہو سکے گا۔ کیونکہ وہ ہر ایک قدرت کا مالک ہے۔ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ جیسا کہ وہ خود فرماتا ہے۔ اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ ○ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَهٗ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ ○ قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْۤ اَنْشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمُ ○ اَوَلَیْسَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنْ یَّخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلٰی وَهُوَ الْخَلّٰقُ الْعَلِیْمُ ○ اِنَّمَاۤ اَمْرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیْـًٔا اَنْ یَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ یعنی کیا انسان نے نہیں دیکھا۔ کہ ہم نے اس کو ایک قطرہ پانی سے پیدا کیا۔ جو رحم میں ڈالا گیا تھا۔ پھر وہ ایک جھگڑنے والا آدمی بن گیا۔ ہمارے لئے باتیں بنانے لگا اور اپنی پیدائش بھول گیا۔ اور کہنے لگا کہ یہ کیونکر ممکن ہے کہ جبکہ ہڈیاں بھی سلامت نہیں رہینگی۔ تو پھر انسان نئے سرے زندہ ہوگا۔ ایسی قدرت والا کون ہے۔ جو اس کو زندہ کرے گا۔ انکو کہو وہی زندہ کرے گا۔ جس نے پہلے اس کو پیدا کیا تھا۔ اور وہ ہر ایک قسم سے اور ہر ایک راہ سے زندہ کرنا جانتا ہے۔ اس کے حکم کی یہ شان ہے کہ جب کسی چیز کے ہونے کا ارادہ کرتا ہے۔ تو صرف یہی کہتا ہے کہ ہو۔ پس وہ چیز پیدا ہو جاتی ہے۔ پس وہ ذات پاک ہے۔ جسکی ہر ایک چیز پر بادشاہی ہے۔ اور تم سب اسی کی طرف رجوع کرو گے۔ سو ان آیات میں اللہ جلشانہٗ نے فرما دیا ہے کہ خدا کے آگے کوئی چیز اَن ہونی نہیں۔ جس نے ایک قطرۂ حقیر سے انسان کو پیدا کیا۔ کیا وہ دوسری مرتبہ پیدا کرنے سے عاجز ہے ؟

اس جگہ ایک اور سوال ناواقفوں کی طرف سے ہو سکتا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جس حالت میں تیسرا عالم جو عالمِ بعث ہے۔ مدت دراز کے بعد آئے گا۔ تو اس صورت میں ہر نیک و بد کے لئے عالمِ برزخ صرف بطور حوالات کے ہوا۔ جو ایک عبث معلوم ہوتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ ایسا سمجھنا سراسر غلطی ہے۔ جو محض

ناواقفی سے پیدا ہوتی ہے۔ بلکہ خدا تعالےٰ کی کتاب میں نیک و بد کی جزا کے لئے وہ مقام پائے جاتے ہیں۔ ایک عالم برزخ جس میں مخفی طور پر ہر ایک شخص اپنی جزا پائے گا۔ برے لوگ مرنے کے بعد ہی جہنم میں داخل ہونگے۔ نیک لوگ مرنے کے بعد ہی جنت میں آرام پائیں گے۔ چنانچہ اس قسم کی آیتیں قرآن شریف میں بکثرت ہیں کہ بمجرد موت کے ہر ایک انسان اپنے اعمال کی جزا دیکھ لیتا ہے جیسا کہ خدا تعالےٰ ایک بہشتی کے بارے میں خبر دیتا ہے اور فرماتا ہے قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ یعنی اس کو کہا گیا۔ کہ تو بہشت میں داخل ہو۔ اور ایسا ہی ایک دوزخی کی خبر دیکر فرماتا ہے۔ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَاۗءِ الْجَحِيْمِ ۝ یعنی ایک بہشتی کا ایک دوست دوزخی تھا۔ جب وہ دونوں مر گئے۔ تو بہشتی حیران تھا کہ میرا دوست کہاں ہے۔ پس اس کو دکھلایا گیا کہ وہ جہنم کے درمیان ہے۔ سو جزا سزا کی کارروائی تو بلا توقف شروع ہو جاتی ہے۔ اور دوزخی دوزخ میں اور بہشتی بہشت میں جاتے ہیں۔ مگر اس کے بعد ایک اور تجلی اعلےٰ کا دن آتا ہے جو خدا کی بڑی حکمت نے اس دن کے ظاہر کرنے کا تقاضا کیا ہے۔ کیونکہ اس نے انسان کو پیدا کیا۔ تا وہ اپنی خالقیت کے ساتھ شناخت کیا جائے۔ اور پھر وہ سب کو ہلاک کرے گا۔ تا وہ اپنی قہاریت کے ساتھ شناخت کیا جائے۔ اور پھر ایک دن سب کو کامل زندگی بخش کر ایک میدان میں جمع کریگا تا کہ وہ اپنی قادریت کے ساتھ پہچانا جائے۔ اب جاننا چاہیئے۔ کہ دقائق مذکورہ میں سے یہ پہلا دقیقہ معرفت تھا۔ جس کا بیان ہوا +

دوسرا دقیقہ معرفت۔ دوسرا دقیقہ معرفت جس کو عالم معاد کے متعلق قرآن شریف نے ذکر فرمایا ہے۔ وہ یہ ہے کہ عالم معاد میں وہ تمام امور جو دنیا میں روحانی تھے۔ جسمانی طور پر متمثل ہونگے۔ خواہ عالم معاد میں برزخ کا درجہ ہو یا عالم بعث کا درجہ۔ اس بارے میں جو کچھ خدا تعالےٰ نے فرمایا ہے۔ اس میں سے ایک آیت یہ ہے۔ مَنْ كَانَ

دوسرا دقیقہ معرفت

فِی ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی وَ اَضَلُّ سَبِیْلًا۔ یعنی جو شخص اس جہان میں اندھا ہوگا۔ وہ دوسرے جہان میں بھی اندھا ہوگا۔ اس آیت کا مقصد یہ ہے کہ اس جہان کی رُوحانی نابینائی اس جہان میں جسمانی طور پر مشہود اور محسوس ہوگی۔ ایسا ہی دوسری آیت میں فرمایا ہے۔ خُذُوْہُ فَغُلُّوْہُ ثُمَّ الْجَحِیْمَ صَلُّوْہُ ثُمَّ فِیْ سِلْسِلَۃٍ ذَرْعُھَا سَبْعُوْنَ ذِرَاعًا فَاسْلُکُوْہُ یعنی اس جہنمی کو پکڑو۔ اسکی گردن میں طوق ڈالو۔ پھر دوزخ میں اس کو جلاؤ پھر ایسی زنجیر میں جو پیمائش میں ستر گز ہے۔ اس کو داخل کرو۔ جاننا چاہیئے۔ کہ ان آیات میں ظاہر فرمایا ہے کہ دُنیا کا روحانی عذاب عالمِ معاد میں جسمانی طور پر نمودار ہوگا۔ چنانچہ طوق گردن دنیا کی خواہشوں کا جس نے انسان کے سر کو زمین کی طرف جھکا رکھا تھا۔ وہ عالم ثانی میں ظاہری صورت پر نظر آجائے گا۔ اور ایسا ہی دنیا کی گرفتاریوں کی زنجیر پیروں میں پڑی ہوئی دکھائی دیگی۔ اور دنیا کی خواہشوں کی سوزشوں کی آگ ظاہر ظاہر بھڑکی ہوئی نظر آئے گی۔ فاسق انسان دنیا کی زندگی میں ہَوا و ہوس کا ایک جہنم اپنے اندر رکھتا ہے اور ناکامیوں میں اس جہنّم کی سوزشوں کا احساس کرتا ہے۔ پس جبکہ اپنی فانی شہوات سے دُور ڈالا جائے گا۔ اور ہمیشہ کی ناامیدی طاری ہوگی۔ تو خدا تعالےٰ ان حسرتوں کو جسمانی آگ کے طور پر اس پر ظاہر کرے گا جیساکہ وہ فرماتا ہے۔ وَحِیْلَ بَیْنَھُمْ وَبَیْنَ مَا یَشْتَھُوْنَ ۝ یعنی ان میں اور ان کی خواہشوں کی چیزوں میں جُدائی ڈالی جائیگی اور یہی عذاب کی جڑھ ہوگی۔ اور پھر جو فرمایا۔ کہ ستر گز کی زنجیر میں اس کو داخل کرو۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ ایک فاسق بسا اوقات ستر برس کی عمر پالیتا ہے۔ بلکہ کئی دفعہ اس دنیا میں اس کو ایسے ستر برس بھی ملتے ہیں۔ کہ خورد سالی کی عمر اور پیر فرتوت ہونے کی عمر الگ کرکے پھر اس قدر صاف اور خالص حصّہ عمر کا اس کو ملتا ہے۔ جو عقلمندی اور محنت اور کام کے لائق ہوتا ہے۔ لیکن وہ بدبخت

دوزخ میں ستر گز زنجیر کی حقیقت

اپنی عمدہ زندگی کے ستر برس دنیا کی گرفتاریوں میں گذارتا ہے۔ اور اس زنجیر سے آزاد ہونا نہیں چاہتا۔ سو خدا تعالےٰ اس آیت میں فرماتا ہے کہ وہی ستر برس جو اس نے گرفتاری دُنیا میں گذارے تھے۔ عالم معاد میں زنجیر کی طرح متمثل ہو جائیں گے۔ جو ستر گز کی ہوگی۔ ہر ایک گز بجائے ایک سال کے ہے۔ اس جگہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ خدا تعالیٰ اپنی طرف سے بندہ پر کوئی مصیبت نہیں ڈالتا۔ بلکہ وہ انسان کے اپنے بُرے کام اس کے آگے رکھ دیتا ہے۔ پھر اسی اپنی سنّت کے اظہار میں خدا تعالےٰ ایک اور جگہ فرماتا ہے۔ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ لَّا ظَلِيْلٍ وَّلَا يُغْنِيْ مِنَ اللَّهَبِ۔ یعنی اے بدکارو گمراہو۔ سہ گوشہ سایہ کی طرف چلو۔ جس کی تین شاخیں ہیں۔ جو سایہ کا کام نہیں دے سکتیں۔ اور نہ گرمی سے بچا سکتی ہیں۔ اس آیت میں تین شاخوں سے مراد قوت سبعی اور بہیمی اور وہمی ہے۔ جو لوگ ان تینوں قوتوں کو اخلاقی رنگ میں نہیں لاتے۔ اور انکی تعدیل نہیں کرتے۔ اُن کی یہ قوتیں قیامت میں اس طرح پر نمودار کی جائیگی۔ کہ گویا تین شاخیں بغیر پتوں کے کھڑی ہیں۔ اور گرمی سے بچا نہیں سکتیں۔ اور وہ گرمی سے جلیں گے۔ پھر ایسا ہی خدا تعالےٰ اپنی اسی سنّت کے اظہار کے لئے بہشتیوں کے حق میں فرماتا ہے يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ یعنی اس روز تو دیکھیگا۔ کہ مومنوں کا یہ نور جو دُنیا میں پوشیدہ طور پر ہے۔ ظاہر ظاہر ان کے آگے اور ان کے داہنی طرف دوڑتا ہوگا۔ اور پھر ایک اور آیت میں فرماتا ہے۔ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ۔ یعنی اس دن بعض منہ سیاہ ہو جائینگے۔ اور بعض سفید اور نورانی ہو جائیں گے۔ اور پھر ایک اور آیت میں فرماتا ہے۔ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ فِيْهَآ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَيْرِ اٰسِنٍ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهٗ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ وَاَنْهٰرٌ

بہشتیوں کے اعمال کی شکل

بہشت کا نمونہ

مِنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى۔ یعنی وہ بہشت جو پرہیزگاروں کو دیا جاویگا۔ اسکی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک باغ ہے۔ اس میں اس پانی کی نہریں ہیں جو کبھی متعفن نہیں ہوتا۔ اور نیز اس میں اس دودھ کی نہریں ہیں جس کا کبھی مزہ نہیں بدلتا۔ اور نیز اس میں اس شہد کی نہریں ہیں جو نہایت صاف ہے جس کے ساتھ کوئی کثافت نہیں۔ اور نیز اس میں شراب کی نہریں ہیں۔ جو سراسر سرور بخش ہے۔ جس کے ساتھ خمار نہیں۔ اس جگہ صاف طور پر فرمادیا۔ کہ اس بہشت کو مثالی طور پر یوں سمجھ لو کہ ان تمام چیزوں کی اس میں ناپیدا کنار نہریں ہیں۔ وہ زندگی کا پانی جو عارف دنیا میں روحانی طور پر پیتا ہے۔ اس میں ظاہری طور پر موجود ہے۔ اور وہ روحانی دودھ جس سے وہ شیرخوار بچہ کی طرح روحانی طور پر دُنیا میں پرورش پاتا ہے۔ بہشت میں ظاہر ظاہر دکھائی دیگا۔ اور وہ خدا کی محبت کی شراب جس سے وہ دنیا میں روحانی طور پر ہمیشہ مست رہتا تھا اب بہشت میں ظاہر ظاہر اسکی نہریں نظر آئینگی۔ اور وہ حلاوت ایمانی کا شہد جو دنیا میں روحانی طور پر عارف کے مُنہ میں جاتا تھا۔ وہ بہشت میں محسوس اور نمایاں نہروں کی طرح دکھائی دے گا۔ اور ہر ایک بہشتی اپنی نہروں اور اپنے باغوں کے ساتھ اپنی روحانی حالت کا اندازہ برہنہ کر کے دکھلا دیگا۔ اور خدا بھی اُس دن بہشتیوں کے لئے حجابوں سے باہر آجائے گا۔ غرض روحانی حالتیں مخفی نہیں رہینگی۔ بلکہ جسمانی طور پر نظر آئینگی *

ترقیات غیر متناہی ہونگی

تیسرا دقیقہ معرفت۔ تیسرا دقیقہ معرفت کا یہ ہے کہ عالم معاد میں ترقیات غیر متناہی ہونگی۔ اس میں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ یعنی جو لوگ دنیا میں ایمان کا نور رکھتے ہیں۔ اُن کا نور قیامت کو ان کے آگے اور ان کے داہنے طرف دوڑتا ہوگا۔ وہ ہمیشہ یہی

کہتے رہینگے - کہ اے خدا ہمارے نور کو کمال تک پہنچا - اور اپنی مغفرت کے اندر ہمیں لے لے - تو ہر چیز پر قادر ہے - اس آیت میں یہ جو فرمایا - کہ وہ ہمیشہ یہی کہتے رہینگے - کہ اے خدا ہمارے نور کو کمال تک پہنچا - یہ ترقیات غیر متناہیہ کی طرف اشارہ ہے یعنی ایک کمال نورانیت کا انہیں حاصل ہوگا - پھر دوسرا کمال نظر آئے گا - اس کو دیکھ کر پہلے کمال کو ناقص پائینگے - پس کمال ثانی کے حصول کے لئے التجا کرینگے - اور جب وہ حاصل ہوگا - تو ایک تیسرا مرتبہ کمال کا ان پر ظاہر ہوگا - پھر اس کو دیکھ کر پہلے کمالات کو ہیچ سمجھیں گے اور اسکی خواہش کرینگے یہی ترقیات کی خواہش ہے - جو اَتْمِمْ کے لفظ سے سمجھی جاتی ہے ۔

بہشت میں مغفرت مانگنے کا مطلب

غرض اسی طرح غیر متناہی سلسلہ ترقیات کا چلا جائیگا - تنزل کبھی نہیں ہوگا - اور نہ کبھی بہشت سے نکالے جائینگے - بلکہ ہر روز آگے بڑھیں گے نہ پیچھے کو - اور یہ جو فرمایا - کہ وہ ہمیشہ اپنی مغفرت چاہینگے اس جگہ سوال یہ ہے کہ جب بہشت میں ہوگئے تو پھر مغفرت میں کیا کسر رہ گئی - اور جب گناہ بخشے گئے - تو پھر استغفار کی طرف کونسی حاجت رہی - اس کا جواب یہ ہے - کہ مغفرت کے اصل معنے یہ ہیں - ناملائم اور ناقص حالت کو نیچے دبانا اور ڈھانکنا سو بہشتی اس بات کی خواہش کرینگے کہ کمال تام حاصل کریں - اور سراسر نور میں غرق ہو جائیں - وہ دوسری حالت کو دیکھ کر پہلی حالت کو ناقص پائینگے - پس چاہیں گے - کہ پہلی حالت نیچے دبائی جائے - پھر تیسرے کمال کو دیکھ کر یہ آرزو کرینگے - کہ دوسرے کمال کی نسبت مغفرت ہو - یعنی وہ حالت ناقصہ نیچے دبائی جائے - اور مخفی کی جائے اسی طرح غیر متناہی مغفرت کے خواہشمند رہینگے - یہ وہی لفظ مغفرت اور استغفار کا ہے - جو بعض نادان بطور اعتراض ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی نسبت پیش کیا کرتے ہیں - سو ناظرین نے اس جگہ سے سمجھ لیا ہوگا - کہ یہی

خواہش استغفار فخر انسان ہے۔ جو شخص کسی عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا اور پھر ہمیشہ کے لئے استغفار اپنی عادت نہیں پکڑتا۔ وہ کیڑا ہے۔ نہ انسان۔ اور اندھا ہے نہ سوجاکھا۔ اور ناپاک ہے۔ نہ طبیب +

بہشت دوزخ انسان کی زندگی کے اظلال ہیں

اب خلاصہ کلام یہ ہے۔ کہ قرآن شریف کی رُو سے دوزخ اور بہشت دونوں اصل میں انسان کی زندگی کے اظلال اور آثار ہیں۔ کوئی ایسی نئی جسمانی چیز نہیں ہے کہ جو دوسری جگہ سے آوے۔ یہ سچ ہے۔ کہ وہ دونوں جسمانی طور سے متمثل ہونگے۔ مگر وہ اصل روحانی حالتوں کے اظلال و آثار ہونگے ہم لوگ ایسی بہشت کے قائل نہیں۔ کہ صرف جسمانی طور پر ایک زمین پر درخت لگائے گئے ہوں۔ اور نہ ایسی دوزخ کے ہم قائل ہیں جس میں درحقیقت گندھک کے پتھر ہیں۔ بلکہ اسلامی عقیدہ کے موافق بہشت و دوزخ انہی اعمال کے انعکاسات ہیں۔ جو دنیا میں انسان کرتا ہے +

تیسرا سوال

دنیا میں زندگی کے مدعا کیا ہیں۔ اور ان کا حصول کس طرح ہوتا ہے

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ مختلف الطبائع انسان اپنی کوتہ فہمی یا پست ہمتی سے مختلف طور کے مدعا اپنی زندگی کے لئے ٹھہراتے ہیں۔ اور فقط دنیا کے مقاصد اور آرزوؤں تک چل کر آگے ٹھہر جاتے ہیں۔ مگر وہ مدعا جو خدا تعالےٰ اپنے پاک کلام میں بیان فرماتا ہے۔ یہ ہے۔ فرماتا ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ٥ یعنی میں نے جن اور انسان کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ مجھے پہچانیں۔ اور میری پرستش کریں۔ پس اس آیت کی رُو سے اصل مدعا انسان کی زندگی کا خدا تعالےٰ کی پرستش اور خدا تعالیٰ کی معرفت اور خدا تعالےٰ کے لئے ہو جانا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے۔ کہ انسان کو یہ مرتبہ حاصل

عبادت الٰہی انسان کی زندگی کا مدعا

نہیں ہے۔ کہ اپنی زندگی کا مدعا اپنے اختیار سے آپ مقرر کرے۔ کیونکہ انسان
نہ اپنی مرضی سے آتا ہے اور نہ اپنی مرضی سے واپس جائے گا۔ بلکہ وہ ایک مخلوق
ہے۔ اور جس نے اُسے پیدا کیا اور تمام حیوانات کی نسبت عمدہ اور اعلیٰ قوی
اُس کو عنایت کئے۔ اسی نے اس کی زندگی کا ایک مدعا ٹھہرا رکھا ہے۔ خواہ کوئی
انسان اس مدعا کو سمجھے یا نہ سمجھے۔ مگر انسان کی پیدائش کا مدعا بلاشبہ خدا کی
پرستش اور خدا کی معرفت اور خدا میں فانی ہو جانا ہی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ
قرآن شریف میں ایک اور جگہ فرماتا ہے۔ اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ
ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ ○ فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا
یعنی وہ دین جس میں خدا کی معرفت صحیح اور اسکی پرستش احسن طور پر ہے
وہ اسلام ہے۔ اور اسلام انسان کی فطرت میں رکھا گیا ہے اور خدا نے
انسان کو اسلام پر پیدا کیا۔ اور اسلام کے لئے پیدا کیا ہے۔ یعنی یہ
چاہا ہے۔ کہ انسان اپنے تمام قویٰ کے ساتھ اسکی پرستش اور اطاعت
اور محبت میں لگ جائے اسی وجہ سے اس قادر کریم نے انسان کو تمام قویٰ

اسلام انسان کی فطرت میں داخل ہے

اسلام کے مناسب حال عطا کئے ہیں۔ ان آیتوں کی تفصیل بہت بڑی ہے اور
ہم کسی قدر پہلے سوال کے تیسرے حصہ میں لکھ بھی چکے ہیں۔ لیکن اب ہم مختصر طور پر
صرف یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں۔ کہ انسان کو جو کچھ اندرونی اور بیرونی اعضا دئے
گئے ہیں۔ یا جو کچھ قوتیں عنایت ہوئی ہیں۔ اصل مقصود ان سے خدا کی معرفت
اور خدا کی پرستش اور خدا کی محبت ہے۔ اسی وجہ سے انسان دنیا میں ہزارہا
شغلوں کو اختیار کر کے پھر بھی بجز خدا کے اپنی سچی خوشحالی کسی میں نہیں پاتا
بڑا دولتمند ہو کر بڑا عہدہ پا کر بڑا تاجر بنکر بڑی بادشاہی تک پہنچ کر بڑا فلاسفر
کہلا کر آخر ان دنیوی گرفتاریوں سے بڑی حسرتوں کے ساتھ جاتا ہے۔ اور ہمیشہ
دل اس کا دنیا کے استغراق سے اس کو ملزم کرتا رہتا ہے۔ اور اسکے مکروں
اور فریبوں اور ناجائز کاموں میں کبھی اس کا کانشنس اس سے اتفاق نہیں

کرتا- ایک دانا انسان اس مسئلہ کو اس طرح بھی سمجھ سکتا ہے- کہ جس چیز کے قوئ ایک اعلےٰ سے اعلےٰ کام کر سکتے ہیں- اور پھر آگے جا کر ٹھہر جاتے ہیں وہی اعلیٰ کام اس کی پیدائش کی علت غائی سمجھی جاتی ہے مثلاً بیل کا کام اعلیٰ سے اعلیٰ قلبہ رانی یا آبپاشی یا باربرداری ہے- اس سے زیادہ اسکی قوتوں میں کچھ ثابت نہیں ہوا- سو بیل کی زندگی کا مدعا یہی تین چیزیں ہیں- اس سے زیادہ کوئی قوت اس میں پائی نہیں جاتی- مگر جب ہم انسان کی قوتوں کو ٹٹولتے ہیں کہ ان میں اعلیٰ سے اعلیٰ کونسی قوت ہے- تو یہی ثابت ہوتا ہے کہ خدائے اعلےٰ برتر کی اس میں تلاش پائی جاتی ہے- یہاں تک کہ وہ چاہتا ہے- کہ خدا کی محبت میں ایسا گداز اور محو ہو کہ اس کا اپنا کچھ بھی نہ رہے- سب خدا کا ہو جائے- وہ کھانے اور سونے وغیرہ طبعی امور میں دوسرے حیوانات کو اپنا شریک غالب رکھتا ہے- صنعت کاری میں بعض حیوانات اس سے بہت بڑھے ہوئے ہیں بلکہ شہد کی مکھیاں بھی ہر ایک پھول کا عطر نکال کر ایسا شہد نفیس پیدا کرتی ہیں- کہ اب تک اس صنعت میں انسان کو کامیابی نہیں ہوئی- پس ظاہر ہے کہ انسان کا اعلےٰ کمال خدا تعالیٰ کا وصال ہے- لہذا اس کی زندگی کا اصل مدعا یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف اس کے دل کی کھڑکی کھلے- ہاں اگر یہ سوال ہو کہ یہ مدعا کیونکر اور کس طرح حاصل ہو سکتا ہے- اور کن وسائل سے انسان اس کو پا سکتا ہے؟

پس واضح ہو- کہ سب سے پہلا وسیلہ جو اس مدعا کے پانے کے لئے شرط ہے- وہ یہ ہے- کہ خدا تعالیٰ کو صحیح طور پر پہچانا جائے- اور سچے خدا پر ایمان لایا جائے- کیونکہ اگر پہلا قدم ہی غلط ہے- اور کوئی شخص مثلاً کسی پرند یا چرند یا عناصر یا انسان کے بچہ کو خدا سمجھ بیٹھا ہے- تو پھر دوسرے قدموں میں اس کے راہ راست پر چلنے کی کیا امید ہے- سچا خدا اس کے ڈھونڈنے والوں کو مدد دیتا ہے- مگر مُردہ مُردہ کو کیونکر مدد دے سکتا ہے- اس میں

[illegible]

پہلا وسیلہ سچے خدا پر ایمان لانا

اللہ جلّ شانہٗ نے خوب تمثیل فرمائی ہے اور وہ یہ ہے۔ لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ
وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ
كَفَّيْهِ اِلَى الْمَاۤءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ وَمَا دُعَاۤءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا
فِيْ ضَلٰلٍ ۝ یعنی دعا کرنے کے لائق وہی سچا خدا ہے۔ جو ہر ایک بات پر قادر ہے
اور جو لوگ اس کے سوا اوروں کو پکارتے ہیں۔ وہ کچھ بھی ان کو جواب نہیں دے
سکتے۔ ان کی مثال ایسی ہے۔ کہ جیسا کوئی پانی کی طرف ہاتھ پھیلادے کہ اے
پانی میرے منہ میں آجا۔ تو کیا وہ اس کے منہ میں آجائے گا۔ ہرگز نہیں۔ سو جو
لوگ سچے خدا سے بے خبر ہیں۔ ان کی تمام دعائیں باطل ہیں ؎

دوسرا وسیلہ خدا کا حسن و جمال

دوسرا وسیلہ خدا تعالےٰ کے اس حسن و جمال پر اطلاع پانا ہے۔ جو
باعتبار کمال تام کے اس میں پایا جاتا ہے۔ کیونکہ حسن ایک ایسی چیز ہے
جو بالطبع دل اسکی طرف کھینچا جاتا ہے۔ اور اس کے مشاہدہ سے طبعاً
محبت ہوتی ہے۔ تو حسن باری تعالیٰ اس کی وحدانیت اور اس کی عظمت
اور بزرگی اور صفات ہیں۔ جیسا کہ قرآن شریف نے فرمایا۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ
اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ
یعنی خدا اپنی ذات اور صفات اور جلال میں ایک ہے۔ کوئی اس کا شریک
نہیں۔ سب اس کے حاجتمند ہیں۔ ذرہ ذرہ اس سے زندگی پاتا ہے۔ وہ کل
چیزوں کے لئے مبدء فیض ہے۔ اور آپ کسی سے فیضیاب نہیں۔ وہ نہ کسی کا
بیٹا ہے۔ اور نہ کسی کا باپ۔ اور کیونکر ہو کہ اس کا کوئی ہم ذات نہیں۔ قرآن
نے بار بار خدا کا کمال پیش کرکے اور اسکی عظمتیں دکھلا کے لوگوں کو توجہ دلائی
ہے۔ کہ دیکھو ایسا خدا دلوں کا مرغوب ہے نہ کہ مُردہ اور کمزور اور کم رحم اور کم قدرت۔

تیسرا وسیلہ خدا کے احسان

تیسرا وسیلہ جو مقصود حقیقی تک پہنچنے کے لئے دوسرے درجہ کا زینہ
ہے خدا تعالیٰ کے احسان پر اطلاع پانا ہے۔ کیونکہ محبت کی محرک دو
ہی چیزیں ہیں۔ حُسن یا احسان۔ اور خدا تعالیٰ کی احسانی صفات

کا خلاصہ سورۂ فاتحہ میں پایا جاتا ہے۔ جیساکہ وہ فرماتا ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ۔ کیونکہ ظاہر ہے۔ کہ
احسان کامل اس میں ہے کہ خدا تعالیٰ اپنے بندوں کو محض نابود سے پیدا کرے
اور پھر ہمیشہ اس کی ربوبیت ان کے شامل حال ہو۔ اور وُہی ہر ایک چیز کا آپ
سہارا ہو۔ اور پھر اس کی تمام قسم کی رحمتیں اس کے بندوں کے لئے ظہور میں
میں آئی ہوں۔ اور اس کا احسان بے انتہا ہو۔ جس کا کوئی شمار نہ کر سکے۔ سو ایسے
احسانوں کو خدا تعالےٰ نے بار بار جتلایا ہے۔ جیساکہ ایک اور جگہ فرماتا ہے
وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا یعنی اگر خدا تعالےٰ کی نعمتوں کو گننا
چاہو۔ تو ہرگز گن نہیں سکو گے۔ چوتھا وسیلہ خدا تعالےٰ نے اصل مقصود
کے پانے کے لئے دُعا کو ٹھہرایا ہے۔ جیساکہ وہ فرماتا ہے۔ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ
لَكُمْ۔ یعنی تم دعا کرو۔ میں قبول کرونگا۔ اور بار بار دُعا کے لئے رغبت
دلائی ہے۔ تا انسان اپنی طاقت سے نہیں بلکہ خدا کی طاقت سے پاوے۔

چوتھا وسیلہ دُعا

پانچواں وسیلہ اصل مقصود کے پانے کے لئے خدا تعالیٰ نے مجاہدہ
ٹھہرایا ہے۔ یعنی اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے اور اپنی
طاقتوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے۔ اور اپنی جان خدا کی
راہ میں خرچ کرنے کے ذریعہ سے۔ اور اپنی عقل کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے
کے ذریعہ سے اس کو ڈھونڈا جائے جیساکہ وہ فرماتا ہے۔ جَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ
وَاَنْفُسِكُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا
لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا یعنی اپنے مالوں اور اپنی جانوں اور اپنے نفسوں کو مع انکی
تمام طاقتوں کے خدا کی راہ میں خرچ کرو۔ اور جو کچھ ہم نے عقل اور علم اور فہم اور
ہنر وغیرہ تم کو دیا ہے۔ وہ سب کچھ خدا کی راہ میں لگاؤ۔ جو لوگ ہماری راہ میں ہر ایک
طور سے کوشش بجا لاتے ہیں۔ ہم ان کو اپنی راہیں دکھا دیا کرتے ہیں۔ چھٹا وسیلہ
اصل مقصود کے پانے کے لئے استقامت کو بیان فرمایا گیا ہے۔ یعنی

پانچواں وسیلہ مجاہدہ

چھٹا وسیلہ استقامت

اس راہ میں درماندہ اور عاجز نہ ہو۔ اور تھک نہ جائے۔ اور امتحان سے ڈر نہ جائے
جیسا کہ اللہ تعالٰے فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ
عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ
تُوْعَدُوْنَ ○ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ۔ یعنی وہ
لوگ جنہوں نے کہا۔ کہ ہمارا رب اللہ ہے اور باطل خداؤں سے الگ ہو گئے
پھر استقامت اختیار کی۔ یعنی طرح طرح کی آزمائشوں اور بلا کے وقت ثابت
قدم رہے۔ ان پر فرشتے اُترتے ہیں۔ کہ تم مت ڈرو۔ اور مت غمگین ہو۔ اور خوش
ہو۔ اور خوشی سے بھر جاؤ۔ کہ تم اس خوشی کے وارث ہو گئے جس کا تمہیں وعدہ دیا
گیا ہے ہم اس دُنیوی زندگی میں اور آخرت میں تمہارے دوست ہیں۔ اس جگہ
ان کلمات سے یہ اشارہ فرمایا ہے کہ استقامت سے خدا تعالٰے کی رضا حاصل
ہوتی ہے۔ یہ سچ بات ہے کہ استقامت فوق الکرامت ہے۔ کمال استقامت
یہ ہے۔ کہ چاروں طرف بلاؤں کو محیط دیکھیں۔ اور خدا کی راہ میں جان اور عزت اور
آبرو کو معرض خطر میں پاویں۔ اور کوئی تسلی دینے والی بات موجود نہ ہو۔ یہاں تک کہ
خدا تعالٰی بھی امتحان کے طور پر تسلی دینے والے کشف یا خواب یا الہام کو بند کردے
اور ہولناک خوفوں میں چھوڑ دے۔ اس وقت نامردی نہ دکھلاویں۔ اور بزدلوں
کی طرح پیچھے نہ ہٹیں۔ اور وفاداری کی صفت میں کوئی خلل پیدا نہ کریں۔ صدق
اور ثبات میں کوئی رخنہ نہ ڈالیں۔ ذلت پر خوش ہو جائیں۔ موت پر راضی ہو
جائیں۔ اور ثابت قدمی کے لئے کسی دوسرے دوست کا انتظار نہ کریں۔ کہ وہ
سہارا دے۔ نہ اس وقت خدا کی بشارتوں کے طالب ہوں۔ کہ وقت نازک
ہے۔ اور باوجود سراسر بیکس اور کمزور ہونے کے اور کسی تسلی کے نہ پانے کے
سیدھے کھڑے ہو جائیں۔ اور ہرچہ بادا باد کہہ کر گردن کو آگے رکھ دیں۔ اور
قضاء و قدر کے آگے دم نہ ماریں۔ اور ہرگز بے قراری اور جزع فزع نہ دکھلاویں
جب تک کہ آزمائش کا حق پورا ہو جائے۔ یہی استقامت ہے۔ جس سے خدا ملتا

ہے۔ یہی وہ چیز ہے جسکی رسولوں اور نبیوں اور صدیقوں اور شہیدوں کی خاک سے اب تک خوشبو آرہی ہے۔ اسی کی طرف اللہ جلشانہٗ اس دعا میں اشارہ فرماتا ہے۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ یعنی اے خدا ہمیں استقامت کی راہ دکھلا۔ وہی راہ جس پر تیرا انعام و اکرام مترتب ہوتا ہے۔ اور تو راضی ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرف اس دوسری آیت میں اشارہ فرمایا۔ رَبَّنَا اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِیْنَ۔ اے خدا اس مصیبت میں ہمارے دل پر وہ سکینت نازل کر۔ جس سے صبر آجائے۔ اور ایسا کر کہ ہماری موت اسلام پر ہو۔ جاننا چاہیئے۔ کہ دکھوں اور مصیبتوں کے وقت میں خدا تعالےٰ اپنے پیارے بندوں کے دل پر ایک نور اتارتا ہے جس سے وہ قوت پاکر نہایت اطمینان سے مصیبت کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اور حلاوت ایمانی سے ان زنجیروں کو بوسہ دیتے ہیں۔ جو اسکی راہ میں ان کے پیروں میں پڑیں جب باخدا آدمی پر بلائیں نازل ہوتی ہیں۔ اور موت کے آثار ظاہر ہو جاتے ہیں۔ تو وہ اپنے رب کریم سے خواہ نخواہ جھگڑا شروع نہیں کرتا۔ کہ مجھے ان بلاؤں سے بچا۔ کیونکہ اس وقت عافیت کی دعا میں اصرار کرنا خدا تعالیٰ سے لڑائی اور موافقت تامہ کے مخالف ہے۔ بلکہ سچا محب بلا کے اترنے سے اور آگے قدم رکھتا ہے۔ اور ایسے وقت میں جان کو ناچیز سمجھ کر اور جان کی محبت کو الوداع کہہ کر اپنے مولےٰ کی مرضی کا بکلی تابع ہو جاتا ہے۔ اور اس کی رضا چاہتا ہے۔ اسی کے حق میں اللہ جلشانہٗ فرماتا ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَہُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ۝ یعنی خدا کا پیارا بندہ اپنی جان خدا کی راہ میں دیتا ہے اور اس کے عوض میں خدا کی مرضی خرید لیتا ہے۔ وہی لوگ ہیں۔ جو خدا کی رحمت خاص کے مورد ہیں۔ غرض وہ استقامت جس سے خدا ملتا ہے۔ اس کی یہی روح ہے۔ جو بیان کی گئی۔ جس کو سمجھنا ہو۔ سمجھ لے ✣

ساتواں وسیلہ راستبازوں کی صحبت ہے

ساتواں وسیلہ اصل مقصود کے پانے کے لئے راستبازوں کی صحبت اوران کے کامل نمونوں کو دیکھنا ہے۔ پس جاننا چاہیئے۔ کہ انبیاء کی ضرورتوں میں سے ایک یہ بھی ضرورت ہے کہ انسان طبعاً کامل نمونہ کا محتاج ہے اور کامل نمونہ شوق کو زیادہ کرتا ہے۔ اور ہمت کو بڑھاتا ہے۔ اور جو نمونے کا پیرو نہیں وہ سست ہوتا ہے اور بہک جاتا ہے۔ اسی کی طرف اللہ جلشانہٗ اس آیت میں اشارہ فرماتا ہے۔ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ ٥ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ یعنی تم اُن لوگوں کی صحبت اختیار کرو۔ جو راستباز ہیں۔ ان لوگوں کی راہیں سیکھو۔ جن پر تم سے پہلے فضل ہو چکا ہے۔

آٹھواں وسیلہ پاک کشف و الہام

آٹھواں وسیلہ خدا تعالےٰ کی طرف سے پاک کشف اور پاک الہام اور پاک خوابیں ہیں۔ چونکہ خدا تعالےٰ کی طرف سفر کرنا ایک نہایت دقیق در دقیق راہ ہے اور اس کے ساتھ طرح طرح کے مصائب اور دکھ لگے ہوئے ہیں۔ اور ممکن ہے کہ انسان اس نادیدہ راہ میں بھول جاوے یا نا امیدی طاری ہو۔ اور آگے قدم بڑھانا چھوڑ دے۔ اس لئے خدا تعالےٰ کی رحمت نے چاہا۔ کہ اپنی طرف سے اس سفر میں ساتھ ساتھ اس کو تسلی دیتی رہے اور اس کی دل دہی کرتی رہے۔ اور اس کی کمر ہمت باندھتی رہے۔ اور اس کے شوق کو زیادہ کرے۔ سو اس کی سنت اور اس کے راہ کے مسافروں کے ساتھ اس طرح پر واقع ہے۔ کہ وقتاً فوقتاً اپنے کلام اور الہام سے انکو تسلی دیتا۔ اور ان پر ظاہر کرتا ہے۔ کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تب وہ قوت پاکر بڑے زور سے اس سفر کو طے کرتے ہیں۔ چنانچہ اس بارے میں وہ فرماتا ہے لَھُمُ الْبُشْرٰی فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَۃِ۔ اسی طرح اور بھی کئی وسائل ہیں۔ جو قرآن شریف نے بیان فرمائے ہیں۔ مگر افسوس کہ ہم اندیشہ طول کی وجہ سے ان کو بیان نہیں کر سکتے +

چوتھا سوال یہ ہے

کہ زندگی میں اور زندگی کے بعد عملی شریعت کا فعل کیا ہے؟
اس سوال کا جواب وہی ہے۔ جو ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ کہ خدا کی سچی اور کامل
شریعت کا فعل جو اس زندگی میں انسان کے دل پر ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اس
کو وحشیانہ حالت سے انسان بنا دے اور پھر انسان سے با اخلاق انسان بناوے
اور پھر با اخلاق انسان سے با خدا انسان بنا دے۔ اور نیز اس زندگی میں عملی
شریعت کا ایک فعل یہ ہے کہ شریعت حقہ پر قائم ہو جانے سے ایسے شخص کا
بنی نوع پر یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ درجہ بدرجہ ان کے حقوق کو پہچانتا ہے اور عدل
اور احسان اور ہمدردی کی قوتوں کو اپنے اپنے محل پر استعمال کرتا ہے اور جو
کچھ خدا نے اس کو علم اور معرفت اور مال اور آسائش میں سے حصہ دیا ہے سب
لوگوں کو حسب مراتب ان نعمتوں میں شریک کر دیتا ہے۔ وہ تمام بنی نوع پر
سورج کی طرح اپنی تمام روشنی ڈالتا ہے اور چاند کی طرح حضرت اعلیٰ سے
نور پا کر وہ نور دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ وہ دن کی طرح روشن ہو کر نیکی اور
بھلائی کی راہیں لوگوں کو دکھاتا ہے۔ وہ رات کی طرح ہر ایک ضعیف کی پردہ
پوشی کرتا ہے اور تھکوں اور ماندوں کو آرام پہنچاتا ہے۔ وہ آسمان کی طرح
ہر ایک حاجتمند کو اپنے سایہ کے نیچے جگہ دیتا ہے۔ اور وقتوں پر اپنے فیض
کی بارشیں برساتا ہے۔ وہ زمین کی طرح کمال انکسار سے ہر ایک آدمی کی
آسائش کے لئے بطور فرش کے ہو جاتا۔ اور سب کو اپنی کنار عاطفت میں لے
لیتا۔ اور طرح طرح کے روحانی میوے ان کے لئے پیش کرتا ہے۔ سو یہی کامل
شریعت کا اثر ہے۔ کہ کامل شریعت پر قائم ہونے والا حق اللہ اور حق العباد کو
کمال کے نقطہ تک پہنچا دیتا ہے۔ خدا میں وہ محو ہو جاتا ہے۔ اور مخلوق کا سچا خادم
بن جاتا ہے۔ یہ تو عملی شریعت کا اس زندگی میں اس پر اثر ہے۔ مگر زندگی کے بعد

جو اثر ہے۔ وہ یہ ہے کہ خدا کا روحانی اتصال اس روز کھلے کھلے دیدار کے طور پر اس کو نظر آئے گا۔ اور خلق اللہ کی خدمت جو اس نے خدا کی محبت میں ہو کر کی جس کا محرک ایمان اور اعمال صالحہ کی خواہش تھی۔ وہ بہشت کے درختوں اور نہروں کی طرح متمثل ہو کر دکھائی دیگی۔ اس میں خدا تعالیٰ کا فرمان یہ ہے۔ وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰهَا۔ وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا۔ وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰهَا وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰهَا۔ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰهَا۔ اِذِ انْۢبَعَثَ اَشْقٰهَا۔ فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ نَاقَةَ اللّٰهِ وَسُقْيٰهَا۔ فَكَذَّبُوْهُ فَعَقَرُوْهَا فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ بِذَنْۢبِهِمْ فَسَوّٰهَا۔ وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا۔ یعنی قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی۔ اور قسم ہے چاند کی۔ جب پیروی کرے سورج کی۔ یعنی سورج سے نور حاصل کرے اور پھر سورج کی طرح اس نور کو دوسروں تک پہنچاوے اور قسم ہے دن کی۔ جب سورج کی صفائی دکھلاوے اور راہوں کو نمایاں کرے۔ اور قسم ہے رات کی۔ جب اندھیرا کرے۔ اور اپنے پردہ تاریکی میں سب کو لے لے۔ اور قسم ہے آسمان کی۔ اور اس علت غائی کی۔ جو آسمان کی اس بناء کی موجب ہوئی۔ اور قسم ہے زمین کی اور اس علت غائی کی۔ جو زمین کے اس قسم کے فرش کا موجب ہوئی۔ اور قسم ہے نفس کی۔ اور نفس کے اس کمال کی جس نے ان سب چیزوں کے ساتھ اس کو برابر کر دیا۔ یعنی وہ کمالات جو متفرق طور پر ان چیزوں میں پائے جاتے ہیں۔ کامل انسان کا نفس ان سب کو اپنے اندر جمع رکھتا ہے۔ اور جیسے یہ تمام چیزیں علیحدہ علیحدہ نوع انسان کی خدمت کر رہی ہیں۔ کامل انسان ان تمام خدمات کو اکیلا بجا لاتا ہے۔ جیسا کہ میں ابھی لکھ چکا ہوں۔ اور پھر فرماتا ہے کہ وہ شخص نجات پا گیا۔ اور موت سے بچ گیا۔ جس نے اس طرح پر نفس کو پاک کیا۔ یعنی سورج اور چاند اور زمین وغیرہ کی طرح

خدا میں محو ہو کر خلق اللہ کا خادم بنا ÷
یاد رہے کہ حیات سے مراد حیات جاودانی ہے جو آئندہ کامل انسان کو حاصل ہو گی۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ عملی شریعت کا پھل آئندہ زندگی میں حیات جاودانی ہے۔ جو خدا کے دیدار کی غذا سے ہمیشہ قائم رہے گی۔ اور پھر فرمایا۔ کہ وہ شخص ہلاک ہو گیا۔ اور زندگی سے نا امید ہو گیا۔ جس نے اپنے نفس کو خاک میں ملا دیا۔ اور جن کمالات کی اس کو استعدادیں دی گئی تھیں ان کمالات کو حاصل نہ کیا۔ اور گندی زندگی بسر کر کے واپس گیا۔ اور پھر مثال کے طور پر فرمایا کہ ثمود کا قصہ اس بدبخت کے قصہ سے مشابہ ہے۔ انہوں نے اس اونٹنی کو زخمی کیا۔ جو خدا کی اونٹنی کہلاتی تھی۔ اور اپنے چشمہ سے پانی پینے سے اس کو روکا۔ سو اس شخص نے درحقیقت خدا کی اونٹنی کو زخمی کیا۔ اور اس کو اس کے چشمہ سے محروم رکھا۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے۔ کہ انسان کا نفس خدا کی اونٹنی ہے۔ جس پر وہ سوار ہوتا ہے۔ یعنی انسان کا دل الٰہی تجلیات کی جگہ ہے اور اس اونٹنی کا پانی خدا کی محبت اور معرفت ہے۔ جس سے وہ جیتی ہے۔ اور پھر فرمایا۔ کہ ثمود نے جب اونٹنی کو زخمی کیا۔ اور اس کو اس کے پانی سے روکا۔ تو ان پر عذاب نازل ہوا اور خدا تعالیٰ نے اس بات کی کچھ بھی پرواہ نہ کی۔ کہ ان کے مرنے کے بعد ان کے بچوں اور بیواؤں کا کیا حال ہو گا۔ سو ایسا ہی جو شخص اس اونٹنی یعنی نفس کو زخمی کرتا ہے اور اس کو کمال تک پہنچانا نہیں چاہتا۔ اور پانی پینے سے روکتا ہے وہ بھی ہلاک ہو گا۔ اس جگہ یہ بھی یاد رہے۔ کہ خدا کا سورج اور چاند وغیرہ کی قسم کھانا ایک نہایت دقیق حکمت پر مشتمل ہے۔ جس سے ہمارے اکثر مخالف ناواقف ہونے کی وجہ سے اعتراض کر بیٹھتے ہیں۔ کہ خدا کو قسموں کی کیا ضرورت پڑی ہے اور اس نے مخلوق کی کیوں قسمیں کھائیں۔ لیکن چونکہ ان کی سمجھ زمینی ہے نہ آسمانی اس لئے وہ معارف حقہ کو سمجھ نہیں سکتے۔ سو واضح ہو کہ قسم کھانے سے اصل مدعا یہ ہوتا ہے۔ کہ قسم کھانے والا اپنے دعوے کے لئے ایک گواہی پیش کرنا چاہتا ہے

کیونکہ جس کے دعوٰی پر کوئی اور گواہ نہیں ہوتا وہ بجائے گواہ کے خدا تعالےٰ کی
قسم کھاتا ہے۔ اس لئے کہ خدا عالم الغیب ہے اور ہر ایک مقدمہ میں وہ پہلا
گواہ ہے۔ گویا وہ خدا کی گواہی اس طرح پیش کرتا ہے۔ کہ اگر خدا تعالیٰ اس قسم
کے بعد خاموش رہا۔ اور اس پر عذاب نازل نہ کیا۔ تو گویا اُس نے اس
شخص کے بیان پر گواہوں کی طرح مُہر لگا دی۔ اس لئے مخلوق کو نہیں چاہیئے
کہ دوسری مخلوق کی قسم کھاوے۔ کیونکہ مخلوق عالم الغیب نہیں۔ اور نہ
جھوٹی قسم پر سزا دینے پر قادر ہے۔ مگر خدا کی قسم ان آیات میں ان معنوں
سے نہیں جیسا کہ مخلوق کی قسم میں مراد لی جاتی ہے۔ بلکہ اس میں یہ سنت اللہ
ہے کہ خدا کے دو قسم کے کام ہیں۔ ایک بدیہی جو سب کی سمجھ میں آسکتے ہیں
اور ان میں کسی کو اختلاف نہیں۔ اور دوسرے وہ کام جو نظری ہیں جن
میں دنیا غلطیاں کھاتی ہے۔ اور باہم اختلاف رکھتی ہے۔ سو خدا تعالےٰ نے چاہا
کہ بدیہی کاموں کی شہادت سے نظری کاموں کو لوگوں کی نظر میں ثابت کر دے ؎

قرآن شریف میں مختلف قسموں کی فلاسفی

پس یہ تو ظاہر ہے کہ سورج اور چاند اور دن اور رات اور آسمان اور زمین
میں وہ خواص درحقیقت پائے جاتے ہیں جن کو ہم ذکر کر چکے ہیں۔ مگر جو اس قسم
کے خواص انسان کے نفس ناطقہ میں موجود ہیں۔ ان سے ہر ایک شخص آگاہ نہیں
سو خدا نے اپنے بدیہی کاموں کو نظری کاموں کے کھولنے کے لئے بطور گواہ کے
پیش کیا ہے گویا وہ فرماتا ہے۔ کہ اگر تم ان خواص سے شک میں ہو۔ جو نفس ناطقہ
انسانی میں پائے جاتے ہیں۔ تو چاند اور سورج وغیرہ میں غور کرو۔ کہ ان میں بدیہی
طور پر یہ خواص موجود ہیں۔ اور تم جانتے ہو کہ انسان ایک عالم صغیر ہے۔ جس کے نفس
میں تمام عالم کا نقشہ اجمالی طور پر مرکوز ہے۔ پھر جبکہ یہ ثابت ہے کہ عالم کبیر کے
بڑے بڑے اجرام یہ خواص اپنے اندر رکھتے ہیں۔ اور اسی طرح پر مخلوقات کو فیض
پہنچا رہے ہیں۔ تو انسان جو ان سب سے بڑا کہلاتا ہے۔ اور بڑے درجہ کا پیدا کیا
گیا ہے۔ وہ کیونکر ان خواص سے خالی اور بے نصیب ہوگا۔ نہیں بلکہ اس میں بھی

سورج کی طرح ایک علمی اور عقلی روشنی ہے۔ جس کے ذریعہ سے وہ تمام دنیا کو منور کر سکتا ہے۔ اور چاند کی طرح وہ حضرت اعلےٰ سے کشف اور الہام اور وحی کا نور پاتا ہے اور دوسروں تک جنہوں نے انسانی کمال ابھی تک حاصل نہیں کیا اس نور کو پہنچاتا ہے۔ پھر کیونکر یہ کہہ سکتی ہو کہ نبوت باطل ہے۔ اور تمام رسالتیں اور شریعتیں اور کتابیں انسان کی مکاری اور خود غرضی ہے۔ یہ بھی دیکھتے ہو کہ کیونکر دن کے روشن ہونے سے تمام راہیں روشن ہو جاتی ہیں۔ تمام نشیب و فراز نظر آجاتے ہیں۔ سو کامل انسان روحانی روشنی کا دن ہے۔ اس کے چڑھنے سے ہر ایک راہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ وہ سچی راہ کو دکھلا دیتا ہے۔ کہ کہاں اور کدھر ہے۔ کیونکہ راستی اور سچائی کا وہی روز روشن ہے۔ ایسا ہی یہ بھی مشاہدہ کر رہے ہو۔ کہ رات کیسی تھکوں ماندوں کو جگہ دیتی ہے۔ تمام دن کے شکستہ کوفتہ مزدور رات کے کنار عاطفت میں بخوشی سوتے ہیں۔ اور محنتوں سے آرام پاتے ہیں اور رات ہر ایک کے لئے پردہ پوش بھی ہے۔ ایسا ہی خدا کے کامل بندے دنیا کو آرام دینے کے لئے آتے ہیں۔ خدا سے وحی اور الہام پانے والے تمام عقلمندوں کو جانکاہی سے آرام دیتے ہیں۔ ان کی طفیل سے بڑے بڑے معارف آسانی کے ساتھ حل ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی وہ خدا کی وحی انسانی عقل کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ جیسا کہ رات پردہ پوشی کرتی ہے۔ اس کی ناپاک خطاؤں کو دنیا پر ظاہر ہونے نہیں دیتی۔ کیونکہ عقلمند وحی کی روشنی کو پاکر اندر ہی اندر اپنی غلطیوں کی اصلاح کر لیتے ہیں۔ اور خدا کے پاک الہام کی برکت سے اپنے تئیں پردہ دری سے بچا لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ افلاطون کی طرح اسلام کے کسی فلاسفر نے کسی بُت پر مُرغ کی قربانی نہ چڑھائی۔ چونکہ افلاطون الہام کی روشنی سے بے نصیب تھا۔ اس لئے دھوکا کھا گیا۔ اور ایسا فلاسفر کہلا کر یہ مکروہ اور احمقانہ حرکت اس سے صادر ہوئی۔ مگر اسلام کے حکماء کو ایسی ناپاک اور احمقانہ حرکتوں سے ہمارے سید و مولیٰ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی

نے بچا لیا۔ اب دیکھو کیسا ثابت ہوا۔ کہ الہام عقلمندوں کا رات کی طرح پردہ پوشی ہے۔ یہ بھی آپ لوگ جانتے ہیں۔ کہ خدا کے کامل بندے آسمان کی طرح ہر ایک درماندہ کو اپنے سایہ میں لے لیتے ہیں۔ خاصکر اُس پاک ذات کے اتباع اور الہام پانے والے عام طور پر آسمان کی طرح فیض کی بارشیں برساتے ہیں ایسا ہی زمین کی خاصیت بھی اپنے اندر رکھتے ہیں۔ ان کے نفس نفیس سے طرح طرح کے علوم عالیہ کے درخت نکلتے ہیں۔ جن کے سایہ اور پھل اور پھول سے لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ سو یہ کھلا کھلا قانون قدرت جو ہماری نظر کے سامنے ہے۔ اسی چھپے ہوئے قانون کا ایک گواہ ہے جسکی گواہی کو قسموں کے پیرایہ میں خدا تعالےٰ نے ان آیات میں پیش کیا ہے۔ سو دیکھو۔ کہ یہ کس قدر پُرحکمت کلام ہے جو قرآن شریف میں پایا جاتا ہے۔ یہ اس کے مُنہ سے نکلا ہے جو ایک اُمّی اور بیابان کا رہنے والا تھا۔ اگر یہ خدا کا کلام نہ ہوتا تو اس طرح عام عقلیں اور وہ تمام لوگ جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں۔ اس کے اس دقیق نکتہ معرفت سے عاجز آکر اعتراض کی صورت میں اس کو نہ دیکھتے۔ یہ قاعدہ کی بات ہے۔ کہ انسان جب ایک بات کو کسی پہلو سے بھی اپنی مختصر عقل کے ساتھ نہیں سمجھ سکتا تب ایک حکمت کی بات کو جائے اعتراض ٹھہرا لیتا ہے۔ اور اس کا اعتراض اس بات کا گواہ ہو جاتا ہے کہ وہ دقیقہ حکمت عام عقلوں سے برتر و اعلےٰ تھا۔ تب ہی تو عقلمندوں نے عقلمند کہلا کر پھر بھی اسپر اعتراض کر دیا۔ مگر اب جو یہ راز کھل گیا۔ تو اب اسکے بعد کوئی عقلمند اس پر اعتراض نہیں کرے گا۔ بلکہ اس سے لذت اُٹھائے گا۔ باد رہے۔ کہ قرآن شریف نے وحی اور الہام کی سنّت قدیمہ پر قانون قدرت سے گواہی لانے کے لئے ایک اور مقام میں بھی اسی قسم کی قسم کھائی ہے اور وہ یہ ہے۔ وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الرَّجْعِ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ۔ یعنی اس آسمان کی قسم ہے۔ جسکی طرف سے بارش آتی ہے اور اس زمین کی قسم ہے۔ جو بارش سے طرح طرح کی سبزیاں نکالتی ہے۔ کہ یہ

قرآن خدا کا کلام اور اسکی وحی ہے۔ اور وہ باطل اور حق میں فیصلہ کرنیوالا ہے۔ اور عبث اور بیہودہ نہیں۔ یعنی بے وقت نہیں آیا۔ موسم کے مینہ کیطرح آیا ہے۔ اب خدا تعالےٰ نے قرآن شریف کے ثبوت کے لئے جو اس کی وحی ہے ایک کھلے کھلے قانونِ قدرت کو قسم کے رنگ میں پیش کیا ۔

یعنی قانونِ قدرت میں ہمیشہ یہ بات مشہود اور مرئی ہے کہ ضرورتوں کے وقت آسمان سے بارش ہوتی ہے اور تمام مدار زمین کی سرسبزی کا آسمان کی بارش پر ہے۔ اگر آسمان سے بارش نہ ہو۔ تو رفتہ رفتہ کنوئیں بھی خشک ہو جاتے ہیں پس دراصل زمین کے پانی کا وجود بھی آسمان کی بارش پر موقوف ہے۔ اسی وجہ سے جب کبھی آسمان سے پانی برستا ہے تو زمین کے کنوؤں کا پانی چڑھ آتا ہے کیوں چڑھ آتا ہے۔ اس کا یہی سبب ہے۔ کہ آسمانی پانی زمین کے پانی کو اوپر کیطرف کھینچتا ہے یہی رشتہ وحی اللہ اور عقل میں ہے۔ وحی اللہ یعنی الہام الٰہی آسمانی پانی ہے۔ اور عقل زمینی پانی ہے۔ اور یہ پانی ہمیشہ آسمانی پانی سے جو الہام ہے تربیت پاتا ہے۔ اور اگر آسمانی پانی یعنی وحی ہونا بند ہو جائے۔ تو یہ زمینی پانی بھی رفتہ رفتہ خشک ہو جاتا ہے۔ کیا اس کے واسطے یہ دلیل کافی نہیں۔ کہ جب ایک زمانہ دراز گذر جاتا ہے۔ اور کوئی الہام یافتہ زمین پر پیدا نہیں ہوتا۔ تو عقلمندوں کی عقلیں نہایت گندی اور خراب ہو جاتی ہیں۔ جیسے زمینی پانی خشک ہو جاتا ہے اور سڑ جاتا ہے ۔

اس کے سمجھنے کے لئے اس زمانہ پر ایک نظر ڈالنا کافی ہے۔ جو ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے تشریف لانے سے پہلے اپنا رنگ تمام دنیا میں دکھلا رہا تھا۔ چونکہ اس وقت حضرت مسیح کے زمانہ کو چھ سو برس گذر گئے تھے۔ اور اس عرصہ میں کوئی الہام یافتہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس لئے تمام دنیا نے اپنی حالت کو خراب کر دیا تھا ہر ایک ملک کی تاریخیں پکار پکار کر کہتی ہیں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں مگر آپ کے ظہور سے پہلے تمام دنیا میں خیالات

فائدہ پھیل گئے تھے۔ ایسا کیوں ہوا تھا۔ اور اس کا کیا سبب تھا۔ یہی تو تھا۔ کہ الہام کا سلسلہ مدتوں تک بند ہو گیا تھا۔ آسمانی سلطنت صرف عقل کے ہاتھ میں تھی۔ پس اس ناقص عقل نے کن کن خرابیوں میں لوگوں کو ڈالا۔ کیا اس سے کوئی ناواقف بھی ہے۔ دیکھو الہام کا پانی جب مدت تک نہ برسا۔ تو عقلوں کا پانی کیسا خشک ہو گیا۔ سو ان قسموں میں یہی قانون قدرت اللہ تعالیٰ پیش کرتا ہے اور فرماتا ہے۔ کہ تم غور کر کے دیکھو کہ کیا خدا کا یہ حکم اور دائمی قانون قدرت نہیں کہ زمین کی تمام سرسبزی کا مدار آسمان کا پانی ہے۔ سو اس پوشیدہ قانون قدرت کے لئے جو الہام الٰہی کا سلسلہ ہے۔ یہ کھلا کھلا قانون قدرت بطور گواہ کے ہے۔ سو اس گواہ سے فائدہ اٹھاؤ۔ اور صرف عقل کو اپنا رہبر مت بناؤ۔ کہ وہ ایسا پانی نہیں ہے۔ جو آسمانی پانی کے سوا موجود رہ سکے۔ جس طرح آسمانی پانی کا یہ خاصہ ہے کہ خواہ کسی کنوئیں میں اس کا پانی پڑے۔ یا نہ پڑے وہ اپنی طبعی خاصیت سے تمام کنوؤں کے پانی کو اوپر چڑھاتا ہے۔ ایسا ہی جب خدا کا ایک الہام یافتہ دنیا میں ظہور فرماتا ہے۔ تو خواہ کوئی عقلمند اس کی پیروی کرے یا نہ کرے۔ مگر اس الہام یافتہ کے زمانہ میں خود عقلوں میں ایسی روشنی اور صفائی آجاتی ہے کہ پہلے اس سے موجود نہ تھی۔ لوگ خواہ نخواہ حق کی تلاش کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور غیب سے ایک حرکت ان کی قوت متفکرہ میں پیدا ہو جاتی ہے۔ سو یہ تمام عقلی ترقی اور دلی جوش اس الہام یافتہ کے قدم مبارک سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اور بالخاصیت زمین کے پانیوں کو اوپر اٹھاتا ہے۔ جب تم دیکھو۔ کہ مذاہب کی جستجو میں ہر ایک شخص کھڑا ہو گیا ہے۔ اور زمینی پانی کو کچھ ابال آیا ہے۔ تو اٹھو اور خبردار ہو جاؤ۔ اور یقیناً سمجھو کہ آسمان سے زور کا مینہ برسا ہے اور کسی دل پر الہامی بارش ہو گئی ہے۔

پانچواں سوال یہ ہے

کہ علم اور معرفت آلہی کے ذریعے کیا کیا ہیں؟

اس سوال کے جواب میں واضح ہو کہ اس بارے میں جس قدر قرآن شریف نے مبسوط طور پر ذکر فرمایا ہے۔ اس کے ذکر کرنے کی تو اس جگہ کسی طرح گنجائش نہیں لیکن بطور نمونہ کسی قدر بیان کیا جاتا ہے۔ سو جاننا چاہیئے۔ کہ قرآن شریف نے علم کو تین قسم پر قرار دیا ہے۔ علم الیقین۔ عین الیقین۔ حق الیقین۔ جیسا کہ ہم پہلے اس سے سورۂ الہٰکم التکاثر کی تفسیر میں ذکر کر چکے ہیں اور بیان کر چکے ہیں۔ کہ علم الیقین وہ ہے۔ کہ شئے مقصود کا کسی واسطہ کے ذریعے سے نہ بلا واسطہ پتہ لگایا جائے۔ جیسا کہ ہم دھوئیں سے آگ کے وجود پر استدلال کرتے ہیں۔ کہ ہم نے آگ کو دیکھا نہیں۔ مگر دھوئیں کو دیکھا ہے۔ کہ جس سے ہمیں آگ کے وجود پر یقین آیا۔ سو یہ علم الیقین ہے۔ اور اگر ہم نے آگ کو ہی دیکھ لیا ہے۔ تو یہ بموجب بیان قرآن شریف یعنی الہٰکم التکاثر کے علم کے مراتب میں سے عین الیقین کے نام سے موسوم ہے اور اگر ہم اس آگ میں داخل بھی ہو گئے ہیں تو اس علم کے مرتبہ کا نام قرآن شریف کے بیان کی رُو سے حق الیقین ہے سورۂ الہٰکم التکاثر کے اب دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ناظرین اس موقع سے اس تفسیر کو آپ دیکھ لیں۔ اب جاننا چاہیئے کہ پہلی قسم کا جو علم ہے۔ یعنی علم الیقین اس کا ذریعہ عقل اور منقولات ہیں۔ اللہ تعالٰے دوزخیوں سے حکایت کر کے فرماتا ہے۔ قَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ یعنی دوزخی کہینگے۔ کہ اگر ہم عقلمند ہوتے اور مذہب اور عقیدہ کو معقول طریقوں سے آزماتے یا کامل عقلمندوں اور محققوں کی تحریروں اور تقریروں کو توجہ سے سُنتے۔ تو آج دوزخ میں نہ پڑتے۔ یہ آیت اس دوسری آیت کے موافق ہے

جہاں اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا۔ یعنی خدا تعالیٰ
انسانی نفوس کو اُن کی وسعت علمی سے زیادہ کسی بات کو قبول کرنیکے لئے
تکلیف نہیں دیتا۔ اور وہی عقیدے پیش کرتا ہے۔ جن کا سمجھنا انسان کے
حد استعداد میں داخل ہے۔ تا اس کے حکم تکلیف مالایطاق میں داخل نہ
ہوں اور ان آیات میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان کانوں
کے ذریعہ سے بھی علم الیقین حاصل کر سکتا ہے۔ مثلاً ہم نے لندن تو نہیں دیکھا
صرف دیکھنے والوں سے اس شہر کا وجود سُنا ہے مگر کیا ہم شک کر سکتے ہیں
کہ شاید ان سب نے جھوٹ بول دیا ہوگا۔ یا مثلاً ہم نے عالمگیر بادشاہ کا زمانہ
نہیں پایا۔ اور نہ عالمگیر کی شکل دیکھی ہے۔ مگر کیا ہمیں اس بات میں کچھ بھی شبہ ہے
کہ عالمگیر چغتائی بادشاہوں میں سے ایک بادشاہ تھا پس ایسا یقین کیوں
حاصل ہوا۔ اس کا جواب یہی ہے۔ کہ صرف سماع کے تواتر سے۔ پس اس میں
شک نہیں۔ کہ سماع بھی علم الیقین کے مرتبہ تک پہنچاتا ہے۔ نبیوں کی کتابیں
اگر سلسلہ سماع میں کچھ خلل نہ رکھتی ہوں۔ وہ بھی ایک سماعی علم کا ذریعہ ہیں۔
لیکن اگر ایک کتاب آسمانی کتاب کہلا کر پھر مثلاً پچاس ساٹھ نسخے اس
کے پائے جائیں۔ اور بعض بعض کے مخالف ہوں تو گو کسی فریق نے یقین بھی کر
لیا ہو۔ کہ ان میں سے صرف دو چار صحیح ہیں۔ اور باقی وضعی اور جعلی لیکن محقق
کے لئے ایسا یقین جو کسی کامل تحقیقات پر مبنی نہیں۔ بیہودہ ہوگا۔ اور نتیجہ یہ
ہوگا۔ کہ وہ سب کتابیں اپنے تناقض کی وجہ سے ردّی اور ناقابل اعتبار
قرار دی جائینگی۔ اور ہرگز جائز نہیں ہوگا۔ کہ ایسے متناقض بیانات کو کسی علم کا
ذریعہ ٹھہرایا جائے۔ کیونکہ علم کی یہ تعریف ہے کہ ایک یقینی معرفت عطا کرے۔ اور
مجموعہ متناقضات میں یقینی معرفت کا پایا جانا ممکن نہیں۔ اس جگہ یاد رہے کہ قرآن
شریف صرف سماع کی حد تک محدود نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں انسانوں کے سمجھانے
کے لئے بڑے بڑے معقول دلائل ہیں۔ اور جس قدر عقائد اور اصول اور احکام

اس نے پیش کئے۔ ان میں سے کوئی امر بھی ایسا نہیں۔ جس میں زبردستی اور تحکم ہو۔ جیسا کہ اس نے خود فرمایا ہے کہ یہ سب عقائد وغیرہ انسان کی فطرت میں پہلے سے منقوش ہیں۔ اور قرآن شریف کا نام ذکر رکھا ہے جیسا کہ فرماتا ہے هٰذَا ذِكْرٌ مُّبَارَكٌ۔ یعنی یہ قرآن بابرکت کوئی نئی چیز نہیں لایا۔ بلکہ جو کچھ انسان کی فطرت اور صحیفہ قدرت میں بھرا پڑا ہے۔ اس کو یاد دلاتا ہے۔ اور پھر ایک جگہ فرماتا ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ۔ یعنی یہ دین کوئی بات جبر سے منوانا نہیں چاہتا۔ بلکہ ہر ایک بات کے دلائل پیش کرتا ہے۔ ماسوا اس کے قرآن میں دلوں کو روشن کرنے کے لئے ایک روحانی خاصیت بھی ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ۔ یعنی قرآن اپنی خاصیت سے تمام بیماریوں کو دور کرتا ہے۔ اس لئے اس کو منقولی کتاب نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ وہ اعلٰے درجہ کے معقول دلائل اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ اور ایک چمکتا ہوا نور اس میں پایا جاتا ہے۔ ایسا ہی عقلی دلائل جو صحیح مقدمات سے مستنبط ہوئے ہوں۔ بلاشبہ علم الیقین تک پہنچاتے ہیں۔ اسی کی طرف اللہ جلشانہ آیات مندرجہ ذیل میں اشارہ فرماتا ہے۔ جیسا کہ وہ کہتا ہے۔ اِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي الْاَلْبَابِ۔ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ۔ یعنی جب دانشمند اور اہل عقل انسان زمین اور آسمان کے اجرام کی بناوٹ میں غور کرتے اور رات دن کی کمی بیشی کے موجبات اور علل کو نظر عمیق سے دیکھتے ہیں۔ انہیں اس نظام پر نظر ڈالنے سے خداتعالے کے وجود پر دلیل ملتی ہے پس وہ زیادہ انکشاف کے لئے خدا سے مدد چاہتے ہیں اور اس کو کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر اور کروٹ پر لیٹ کر یاد کرتے ہیں۔ جس سے ان کی عقلیں بہت صاف ہو جاتی ہیں۔ پس جب وہ ان عقلوں کے ذریعہ سے

اجرام فلکی اور زمین کی بناوٹ احسن اور اولیٰ میں فکر کرتے ہیں۔ تو بے اختیار بول اٹھتے ہیں۔ کہ ایسا نظام ابلغ اور محکم ہرگز باطل اور بے سود نہیں۔ بلکہ صانع حقیقی کا چہرہ دکھلا رہا ہے۔ پس وہ الوہیت صانع عالم کا اقرار کر کے یہ مناجات کرتے ہیں۔ یا الٰہی تو اس سے پاک ہے۔ کہ کوئی تیرے وجود سے انکار کر کے نالائق صفتوں سے تجھے موصوف کرے۔ سو تو ہمیں دوزخ کی آگ سے بچا۔ یعنی تجھ سے انکار کرنا عین دوزخ ہے اور تمام آرام اور راحت تجھ میں اور تیری شناخت میں ہے۔ جو شخص کہ تیری سچی شناخت سے محروم رہا۔ وہ درحقیقت اسی دنیا میں آگ میں ہے ؎

ایسا ہی ایک علم کا ذریعہ انسانی کانشنس بھی ہے جس کا نام خدا کی کتاب میں انسانی فطرت رکھا ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے فِطْرَتَ اللّٰہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا۔ یعنی خدا کی فطرت جس پر لوگ پیدا کئے گئے ہیں اور وہ نقش فطرت کیا ہے۔ یہی کہ خدا کو واحد لاشریک خالق الکل مرنے اور پیدا ہونے سے پاک سمجھنا اور ہم کانشنس کو علم الیقین کے مرتبہ پر اس لئے کہتے ہیں۔ کہ گو بظاہر اس میں ایک علم سے دوسرے علم کی طرف انتقال نہیں پایا جاتا۔ جیسا کہ دھوئیں کے علم سے آگ کے علم کا ہر طرف انتقال پایا جاتا ہے۔ لیکن ایک قسم کے باریک انتقال سے یہ مرتبہ خالی نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر ایک چیز میں خدا نے ایک نامعلوم خاصیت رکھی ہے۔ جو بیان اور تقریر میں نہیں آسکتی۔ لیکن اس چیز پہ نظر ڈالنے اور اس کا تصور کرنے سے بلا توقف اس خاصیت کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے۔ غرض وہ خاصیت اس وجود کو ایسی لازم پڑی ہوتی ہے۔ جیسا کہ آگ کو دھوآں لازم ہے مثلاً جب ہم خدا تعالےٰ کی ذات کی طرف توجہ کرتے ہیں۔ کہ کیسی ہونی چاہیئے آیا خدا ایسا ہونا چاہیئے۔ کہ ہماری طرح پیدا ہو۔ اور ہماری طرح دُکھ اُٹھاوے اور ہماری طرح مرے۔ تو معاً اس تصور سے ہمارا دل دُکھتا ہے۔ اور

کانشنس کا پیتا ہے۔ اور اس قدر جوش دکھلاتا ہے۔ کہ گویا اس خیال کو دھکے دیتا ہے۔ اور بول اُٹھتا ہے۔ کہ وہ خدا جس کی طاقتوں پر تمام امیدوں کا مدار ہے۔ وہ تمام نقصانوں سے پاک اور کامل اور قوی چاہیئے۔ اور جب ہی کہ خدا کا خیال ہمارے دل میں آتا ہے۔ معًا توحید اور خدا میں دھوئیں اور آگ کی طرح بلکہ اس سے بہت زیادہ ملازمت تامہ کا احساس ہوتا ہے۔ لہذا جو علم ہمارے کانشنس کے ذریعہ سے معلوم ہوتا ہے وہ علم الیقین کے مرتبہ میں داخل ہے۔ لیکن اس پر ایک اور مرتبہ ہے۔ جو عین الیقین کہلاتا ہے۔ اور اس مرتبہ سے اس طور کا علم مراد ہے۔ کہ جب ہمارے یقین اور اس چیز میں جس پر کسی نوع کا یقین کیا گیا ہے۔ کوئی درمیانی واسطہ نہ ہو۔ مثلاً جب ہم قوت شامہ کے ذریعہ سے ایک خوشبو یا بدبو کو معلوم کرتے ہیں۔ اور یا ہم قوت ذائقہ کے ذریعہ سے شیریں یا نمکین پر اطلاع پاتے ہیں۔ یا قوت حاسّہ کے ذریعہ سے گرم یا سرد کو معلوم کر لیتے ہیں۔ تو یہ تمام معلومات ہمارے عین الیقین کی قسم ہیں۔ مگر عالم ثانی کے بارے میں ہمارا علم الہیات تب عین الیقین کی حد تک پہنچتا ہے۔ کہ جب خود بلا واسطہ ہم الہام پاویں۔ خدا کی آواز کو اپنے کانوں سے سُنیں اور خدا کے صاف اور صحیح کشفوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔ ہم بیشک کامل معرفت کے حاصل کرنے کے لئے بلا واسطہ الہام کے محتاج ہیں۔ اور اس کامل معرفت کی ہم اپنے دل میں بھوک اور پیاس بھی پاتے ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ نے ہمارے لئے پہلے سے اس معرفت کا سامان میسّر نہیں کیا۔ تو یہ پیاس اور بھوک ہمیں کیوں لگا دی ہے۔ کیا ہم اس زندگی میں جو ہماری آخرت کے ذخیرہ کے لئے یہی ایک پیمانہ ہے۔ اس بات پر راضی ہو سکتے ہیں۔ کہ ہم اس سچے اور کامل اور قادر اور زندہ خدا پر صرف قصّوں اور کہانیوں کے رنگ میں ایمان لاویں۔ یا محض عقلی معرفت پر کفایت کریں۔ جو اَب تک ناقص اور ناتمام معرفت

ہے۔ کیا خدا کے سچے عاشقوں اور حقیقی دلدادوں کا دل نہیں چاہتا۔ کہ اس محبوب کے کلام سے لذّت حاصل کریں۔ کیا جنہوں نے خدا کے لئے تمام دنیا کو برباد کیا۔ دل کھو دیا۔ جان کو دیا۔ وہ اس بات پر راضی ہو سکتے ہیں کہ صرف ایک دُھندلی سی روشنی میں کھڑے رہ کر مرتے رہیں۔ اور اس آفتاب صداقت کا مُنہ نہ دیکھیں۔ کیا یہ سچ نہیں۔ کہ اس زندہ خدا کا اَنَا الْمَوْجُوْد کہنا وہ معرفت کا مرتبہ عطا کرتا ہے۔ کہ اگر دنیا کے تمام فلاسفروں کی خود تراشیدہ کتابیں ایک طرف رکھیں۔ اور ایک طرف اَنَا الْمَوْجُوْد خدا کا کہنا۔ تو اس کے مقابل وہ تمام دفتر ہیچ ہیں۔ جو فلاسفر کہلا کر آپ اندھے رہے۔ وہ ہمیں کیا سکھائیں گے۔ غرض اگر خدا تعالےٰ نے حق کے طالبوں کو کامل معرفت دینے کا ارادہ فرمایا ہے۔ تو ضرور اس نے اپنے مکالمہ اور مخاطبہ کا طریق کھلا رکھا ہے اس بارے میں اللہ جلشانہٗ قرآن شریف میں یہ فرماتا ہے۔ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ۔ یعنی اے خدا ہمیں وہ استقامت کی راہ بتلا۔ جو راہ ان لوگوں کی ہے۔ جن پر تیرا انعام ہوا ہے اس انعام سے مراد الہام اور کشف وغیرہ آسمانی علوم ہیں۔ جو انسان کو براہ راست ملتے ہیں۔ ایسا ہی ایک دوسری جگہ فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْہِمُ الْمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ یعنی جو لوگ خدا پر ایمان لا کر پوری پوری استقامت اختیار کرتے ہیں۔ ان پر خدا تعالےٰ کے فرشتے اُترتے ہیں۔ اور یہ الہام ان کو کرتے ہیں۔ کہ تم کچھ خوف اور غم نہ کرو۔ تمہارے لئے وہ بہشت ہے جسکے بارے میں تمہیں وعدہ دیا گیا ہے۔ سو اس آیت میں بھی صاف لفظوں میں فرمایا ہے۔ کہ خدا تعالےٰ کے نیک بندے غم اور خوف

کے وقت خدا سے الہام پاتے ہیں۔ اور فرشتے اُتر کر ان کی تسلی کرتے ہیں
اور پھر ایک اور آیت میں فرماتا ہے۔ لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
وَفِي الْاٰخِرَةِ۔ یعنی خدا کے دوستوں کو الہام اور خدا کے مکالمہ کے ذریعہ
سے اس دُنیا میں خوشخبری ملتی ہے۔ اور آیندہ زندگی میں بھی ملے گی۔ لیکن

الہام کی حقیقت

اس جگہ یاد رہے۔ کہ الہام کے لفظ سے اس جگہ یہ مراد نہیں ہے کہ
سوچ اور فکر کی کوئی بات دل میں پڑ جائے۔ جیسا کہ جب شاعر شعر
کے بنانے میں کوشش کرتا ہے۔ یا کہ ایک مصرعہ بنا کر دوسرا سوچتا
رہتا ہے۔ تو دوسرا مصرعہ دل میں پڑتا ہے۔ سو یہ دل میں پڑ جانا
الہام نہیں ہے۔ بلکہ یہ خدا کے قانونِ قدرت کے موافق اپنے فکر
اور سوچ کا ایک نتیجہ ہے۔ جو شخص اچھی باتیں سوچتا ہے۔ یا بُری باتوں کے
لئے فکر کرتا ہے۔ اس کی تلاش کے موافق کوئی بات ضرور اس کے دل
میں پڑ جاتی ہے۔ ایک شخص مثلاً نیک اور راستباز آدمی ہے۔ جو سچائی کی
حمایت میں چند شعر بناتا ہے۔ اور دوسرا شخص جو ایک گندہ اور پلید آدمی
ہے۔ اپنے شعروں میں جھوٹ کی حمایت کرتا ہے۔ اور راستبازوں کو گالیاں
نکالتا ہے تو بلاشبہ یہ دونوں کچھ نہ کچھ شعر بنا لینگے۔ بلکہ کچھ تعجب نہیں۔ کہ
وہ راستبازوں کا دشمن جو جھوٹ کی حمایت کرتا ہے۔ بباعث دائمی مشق کے
سے اس کا شعر عمدہ ہو۔ سو اگر صرف دل میں پڑ جانے کا نام الہام ہے۔ تو پھر
ایک بدمعاش شاعر جو راستبازی اور راستبازوں کا دشمن۔ اور ہمیشہ حق
کی مخالفت کے لئے قلم اُٹھاتا۔ اور افتراؤں سے کام لیتا ہے۔ خدا کا ملہم
کہلائے گا۔ دنیا میں ناولوں وغیرہ میں جادو بیانیاں پائی جاتی ہیں۔ اور
تم دیکھتے ہو۔ کہ اس طرح سراسر باطل مگر مسلسل مضمون لوگوں کے دلوں میں
پڑ جاتے ہیں۔ پس کیا ہم ان کو الہام کہہ سکتے ہیں۔ بلکہ اگر الہام صرف دل میں بعض
باتیں پڑنے کا نام ہے۔ تو ایک چور بھی ملہم کہلا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ بسا اوقات

فکر کر کے اچھے طریق نقب زنی کے نکال لیتا ہے۔ اور عمدہ عمدہ تدبیریں ڈاکہ مارنے اور خون ناحق کرنے کی اس کے دل میں گذر جاتی ہیں تو کیا لائق ہے کہ ہم ان تمام ناپاک طریقوں کا نام الہام رکھ دیں۔ ہرگز نہیں بلکہ یہ ان لوگوں کا خیال ہے۔ جن کو اب تک اس سچے خدا کی خبر نہیں۔ جو آپ خاص مکالمہ سے دلوں کو تسلی دیتا اور ناواقفوں کو روحانی علوم سے معرفت بخشتا ہے۔ الہام کیا چیز ہے۔ وہ پاک اور قادر خدا کا ایک برگزیدہ بندہ کے ساتھ یا اس کے ساتھ جس کو برگزیدہ کرنا چاہتا ہے۔ ایک زندہ اور با قدرت کلام کے ساتھ مکالمہ اور مخاطبہ ہے۔ سو جب یہ مکالمہ اور مخاطبہ کافی اور تسلی بخش سلسلہ کے ساتھ شروع ہو جائے۔ اور اس میں خیالات فاسدہ کی تاریکی نہ ہو۔ اور نہ غیر مکتفی اور چند بے سروپا لفظ ہوں۔ اور کلام لذیذ اور پُر حکمت اور پُرشوکت ہو۔ تو وہ خدا کا کلام ہے جس سے وہ اپنے بندے کو تسلی دینا چاہتا ہے۔ اور اپنے تئیں اس پر ظاہر کرتا ہے۔ ہاں کبھی ایک کلام محض امتحان کے طور پر ہوتا ہے اور پورا اور با برکت سامان ساتھ نہیں رکھتا۔ اس میں خدا تعالیٰ کے بندہ کو اس کی ابتدائی حالت میں آزمایا جاتا ہے۔ تا وہ ایک ذرہ الہام کا مزہ چکھ کر پھر واقعی طور پر اپنا حال وقال سچے ملہموں کی طرح بنا وے یا ٹھوکر کھاوے۔ پس اگر وہ حقیقی راستبازی صدیقوں کی طرح اختیار نہیں کرتا۔ تو اس نعمت کے کمال سے محروم رہ جاتا ہے۔ اور صرف بیہودہ لاف زنی اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ کروڑہا نیک بندوں کو الہام ہوتا رہا ہے۔ مگر ان کا مرتبہ خدا کے نزدیک ایک درجہ کا نہیں۔ بلکہ خدا کے پاک نبی جو پہلے درجہ پر کمال صفائی سے خدا کا الہام پانے والے ہیں۔ وہ بھی مرتبہ میں برابر نہیں۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے۔ تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ یعنی بعض نبیوں کو بعض نبیوں پر فضیلت ہے اس سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ الہام محض فضل ہے اور فضیلت کے وجود میں اس کو دخل نہیں۔ بلکہ فضیلت اس

صدق اور اخلاص اور وفاداری کے قدر پر ہے جسکو خدا جانتا ہے۔ ہاں الہام بھی اگر اپنی بابرکت شرائط کے ساتھ ہو۔ تو وہ بھی اُن کا ایک پھل ہے اس میں کچھ شک نہیں۔ کہ اگر اس رنگ میں الہام ہو۔ کہ بندہ سوال کرتا ہے اور خدا اس کا جواب دیتا ہے۔ اسی طرح ایک ترتیب کے ساتھ سوال و جواب ہو۔ اور الہٰی شوکت اور نور الہام میں پایا جائے۔ اور علوم غیب یا معارف صحیحہ پر مشتمل ہو۔ تو وہ خدا کا الہام ہے۔ خدا کے الہام میں یہ ضروری ہے کہ جس طرح ایک دوست دوسرے دوست سے مل کر باہم ہمکلام ہوتا ہے اسی طرح رب اور اس کے بندے میں ہمکلامی واقع ہو۔ اور جب یہ کسی امر میں سوال کرے۔ تو اس کے جواب میں ایک کلام لذیذ فصیح خدا تعالےٰ کی طرف سے سُنے۔ جس میں اپنے نفس اور فکر اور غور کا کچھ بھی دخل نہ ہو۔ اور وہ مکالمہ اور مخاطبہ اس کے لئے موہبت ہو جائے۔ تو وہ خدا کا کلام ہے۔ اور ایسا بندہ خدا کی جناب میں عزیز ہے۔ مگر یہ درجہ کہ الہام بطور موہبت ہو۔ اور زندہ اور پاک الہام کا سلسلہ ایسے بندہ سے خدا کو حاصل ہو۔ اور صفائی اور پاکیزگی کے ساتھ ہو۔ یہ کسی کو نہیں ملتا۔ بجز ان لوگوں کے جو ایمان اور اخلاص اور اعمال صالح میں ترقی کریں اور نیز اس چیز میں جس کو ہم بیان نہیں کر سکتے۔ سچا اور پاک الہام اُلوہیت کے بڑے بڑے کرشمے دکھلاتا ہے۔ بارہا ایک نہایت چمکدار نور پیدا ہوتا ہے۔ اور ساتھ اس کے پُر شوکت اور ایک چمکدار الہام آتا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا۔ کہ ملہم اس ذات سے باتیں کرتا ہے۔ جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے۔ دنیا میں خدا کا دیدار یہی ہے۔ کہ خدا سے باتیں کرے۔ مگر اس ہمارے بیان میں انسان کی وہ حالت داخل نہیں ہے۔ جو کسی کی زبان پر بے ٹھکانہ کوئی لفظ یا فقرہ یا شعر جاری ہو۔ اور ساتھ اس کے کوئی مکالمہ اور مخاطبہ نہ ہو۔ بلکہ ایسا شخص خدا کے امتحان میں گرفتار ہے۔ کیونکہ خدا اس طریق سے

بھی سُست اور غافل بندوں کو آزماتا ہے۔ کہ کبھی کوئی فقرہ یا عبارت کسی کے دل پر یا زبان پر جاری کی جاتی ہے۔ اور وہ شخص اندھے کی طرح ہو جاتا ہے۔ نہیں جانتا کہ وہ عبارت کہاں سے آئی۔ خدا سے یا شیطان سے۔ سو ایسے فقرات سے استغفار لازم ہے۔ لیکن اگر ایک صالح اور نیک بندہ کو بے حجاب مکالمہ الٰہی شروع ہو جائے۔ اور مخاطبہ اور مکالمہ کے طور پر ایک کلام روشن لذیذ پُر معنی پُر حکمت پُوری شوکت کے ساتھ اس کو سنائی دے۔ اور کم سے کم بارہا اُس کو ایسا اتفاق ہو۔ کہ خدا میں اور اس میں عین بیداری میں دس مرتبہ سوال و جواب ہُوا ہو۔ اُس نے سوال کیا۔ خدا نے جواب دیا۔ پھر گذارش عاجزانہ کی۔ خدا نے اس کا بھی جواب عطا فرمایا۔ ایسا ہی دس مرتبہ تک خدا میں اور اس میں باتیں ہوتی رہیں اور خدا نے بارہا ان مکالمات میں اس کی دعائیں منظور کی ہوں۔ عمدہ عمدہ معارف پر اسکو اطلاع دی ہو۔ آنے والے واقعات کی اس کو خبر دی ہو۔ اور اپنے برہنہ مکالمہ سے بار بار کے سوال و جواب میں اس کو مشرف کیا ہو۔ تو ایسے شخص کو خدا تعالےٰ کا بہت شکر کرنا چاہیئے۔ اور سب سے زیادہ خدا کی راہ میں فدا ہونا چاہیئے۔ کیونکہ خدا نے محض اپنے کرم سے اس کو اپنے تمام بندوں میں سے چن لیا۔ اور ان صدیقوں کا اس کو وارث بنا دیا۔ جو اس سے پہلے گذر چکے ہیں۔ یہ نعمت نہایت ہی نادر الوقوع اور خوش قسمتی کی بات ہے جس کو ملی۔ اس کے بعد جو کچھ ہے وہ ہیچ ہے۔

اس مرتبہ اور اس مقام کے لوگ اسلام میں ہمیشہ ہوتے رہے ہیں اور ایک اسلام ہی ہے۔ جس میں خدا بندہ سے قریب ہو کر اس سے باتیں کرتا۔ اور اس کے اندر بولتا ہے۔ وہ اس کے دل میں اپنا تخت بناتا اور اس کے اندر سے اُسے آسمان کی طرف کھینچتا ہے۔ اور اس کو وہ سب نعمتیں عطا فرماتا ہے۔ جو پہلوں کو دی گئیں۔ افسوس اندھی

[illegible]

دنیا نہیں جانتی۔ کہ انسان نزدیک ہوتا ہوتا کہاں تک پہنچ جاتا ہے۔ وہ آپ تو قدم نہیں اُٹھاتے اور جو قدم اُٹھائے تو یا تو اس کو کافر ٹھہرایا جاتا ہے۔ اور یا اس کو معبود ٹھہرا کر خدا کی جگہ دی جاتی ہے۔ یہ دونوں ظلم ہیں۔ ایک افراط سے اور ایک تفریط سے پیدا ہوا۔ مگر عقلمند کو چاہیئے۔ کہ وہ کم ہمت نہ ہو۔ اور اس مقام اور اس مرتبہ کا انکاری نہ رہے۔ اور نہ صاحب اس مرتبہ کی کسر شان کرے اور نہ اس کی پُوجا شروع کرے۔ اس مرتبہ پر خدا تعالےٰ وہ تعلقات اس بندہ سے ظاہر کرتا ہے۔ کہ گویا اپنی اُلوہیت کی چادر اس پر ڈال دیتا ہے۔ اور ایسا شخص خدا کے دیکھنے کا آئینہ بنجاتا ہے۔ یہی بھید ہے جو ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ کہ جس نے مجھے دیکھا۔ اس نے خدا کو دیکھ لیا۔ غرض یہ بندوں کے لئے انتہائی تنبیہہ ہے۔ اور اس پر تمام سلوک ختم ہو جاتے ہیں۔ اور پوری تسلّی ملتی ہے۔ میں بنی نوع پر ظلم کرونگا۔ اگر میں اس وقت ظاہر نہ کروں کہ وہ مقام جس کی میں نے یہ تعریفیں کی ہیں۔ اور وہ مرتبہ مکالمہ اور مخاطبہ کا جس کی میں نے اس وقت تفصیل بیان کی۔ وہ خدا کی عنایت نے مجھے عنایت فرمایا ہے۔ تا میں اندھوں کو بینائی بخشوں۔ اور ڈھونڈنے والوں کو اس گم گشتہ کا پتہ دوں۔ اور سچائی قبول کرنے والوں کو اس پاک چشمہ کی خوشخبری سُناؤں۔ جس کا تذکرہ بہتوں میں ہے۔ اور پانے والے تھوڑے ہیں۔ میں سامعین کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ وہ خدا جس کے ملنے میں انسان کی نجات اور دائمی خوشحالی ہے۔ وہ بجز قرآن شریف کی پیروی کے ہرگز نہیں مل سکتا کاش جو میں نے دیکھا ہے۔ لوگ دیکھیں۔ اور جو میں نے سُنا ہے۔ وہ سنیں۔ اور قصّوں کو چھوڑ دیں اور حقیقت کی طرف دوڑیں۔ وہ کامل علم کا ذریعہ جس سے خدا نظر آتا ہے۔ وہ میل اُتارنے والا پانی جس سے تمام شکوک دُور ہو جاتے ہیں۔ وہ آئینہ جس سے اس برتر ہستی کا درشن ہو جاتا ہے۔ خدا کا وہ مکالمہ اور مخاطبہ ہے۔ جس کا میں ابھی ذکر کر چکا ہوں۔ جس کی رُوح میں سچائی کی طلب ہے

[illegible]

وہ اُٹھے اور تلاش کرے۔ میں سچ سچ کہتا ہوں۔ کہ اگر روحوں میں سچی تلاش پیدا ہو۔ اور دلوں میں سچی پیاس لگ جائے۔ تو لوگ اس طریق کو ڈھونڈیں۔ اور اس راہ کی تلاش میں لگیں۔ مگر یہ راہ کس طریق سے کھلے گی۔ اور حجاب کس دوا سے اُٹھے گا۔ میں سب طالبوں کو یقین دلاتا ہوں۔ کہ صرف اسلام ہی ہے۔ جو اس راہ کی خوشخبری دیتا ہے اور دوسری قومیں تو خدا کے الہام پر مدت سے مُہر لگا چکی ہیں۔ سو یقیناً سمجھو کہ یہ خدا کی طرف سے مُہر نہیں۔ بلکہ محرومی کی وجہ سے انسان ایک حیلہ پیدا کر لیتا ہے۔ اور یقیناً سمجھو کہ جس طرح یہ ممکن نہیں۔ کہ ہم بغیر آنکھوں کے دیکھ سکیں۔ یا بغیر کانوں کے سُن سکیں۔ یا بغیر زبان کے بول سکیں۔ اسی طرح یہ بھی ممکن نہیں ہے کہ بغیر قرآن کے اس پیارے محبوب کا مُنہ دیکھ سکیں +

میں جوان تھا۔ اب بوڑھا ہُوا۔ مگر میں نے کوئی نہ پایا۔ جس نے بغیر اس پاک چشمہ کے اس کھلی کھلی معرفت کا پیالہ پیا ہو +

اے عزیزو! اے پیارو!! کوئی انسان خدا کے ارادوں میں اس سے لڑائی نہیں کر سکتا۔ یقیناً سمجھ لو۔ کہ کامل علم کا ذریعہ خدا تعالیٰ کا الہام ہے جو خدا تعالےٰ کے پاک نبیوں کو ملا پھر بعد اس کے اُس خدا نے جو دریائے فیض ہے۔ یہ ہرگز نہ چاہا۔ کہ آیندہ اس الہام کو مُہر لگا دے اور اس طرح پر دنیا کو تباہ کرے۔ بلکہ اس کے الہام اور مکالمے اور مخاطبے کے ہمیشہ دروازے کھلے ہیں۔ ہاں ان کو ان کی راہوں سے ڈھونڈو۔ تب وہ آسانی سے تمہیں ملیں گے۔ وہ زندگی کا پانی آسمان سے آیا۔ اور اپنے مناسب مقام پر ٹھہرا۔ اب تمہیں کیا کرنا چاہیئے۔ تا تم اس پانی کو پی سکو۔ یہی کرنا چاہیئے کہ اُفتاں و خیزاں اس چشمہ تک پہنچو۔ پھر اپنا مُنہ اُس چشمہ کے آگے رکھ دو تا اس زندگی کے پانی سے سیراب ہو جاؤ۔ انسان کی تمام سعادت اسی میں ہے۔ کہ جہاں اس روشنی کا پتہ ملے۔ اسی طرف دوڑے۔ اور جہاں اس

گم گشتہ دوست کا نشان پیدا ہوا اسی راہ کو اختیار کرے۔ دیکھتے ہو۔ کہ ہمیشہ آسمان سے روشنی اُترتی اور زمین پر پڑتی ہے۔ اسی طرح ہدایت کا سچا نور آسمان سے ہی اترتا ہے۔ انسان کی اپنی ہی باتیں اور اپنی ہی اٹکلیں سچا گیان اس کو بخش نہیں سکتیں۔ کیا تم خدا کو بغیر خدا کی تجلی کے پا سکتے ہو کیا تم بغیر اس آسمانی روشنی کے اندھیرے میں دیکھ سکتے ہو۔ اگر دیکھ سکتے ہو۔ تو شاید اس جگہ بھی دیکھ لو۔ مگر ہماری آنکھیں گو بینا ہوں۔ تاہم آسمانی روشنی کی محتاج ہیں۔ اور ہمارے کان گو شنوا ہوں۔ تاہم اس ہوا کے حاجتمند ہیں جو خدا کی طرف سے چلتی ہے۔ وہ خدا سچا خدا نہیں ہے۔ جو خاموش ہے اور سارا مدار ہماری اٹکلوں پر ہے۔ بلکہ کامل اور زندہ خدا وہ ہے جو اپنے وجود کا آپ پتہ دیتا رہا ہے۔ اور اب بھی اس نے یہی چاہا ہے کہ آپ اپنے وجود کا پتہ دیوے۔ آسمانی کھڑکیاں کھلنے کو ہیں عنقریب صبح صادق ہونے والی ہے۔ مبارک وہ جو اُٹھ بیٹھیں۔ اور اب سچے خدا کو ڈھونڈیں۔ وہی خدا جس پر کوئی گردش اور مصیبت نہیں آتی۔ جس کے جلال کی چمک پر کبھی حادثہ نہیں پڑتا۔ قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ یعنی خدا ہی ہے۔ جو ہر دم آسمان کا نور اور زمین کا نور ہے۔ اسی سے ہر ایک جگہ روشنی پڑتی ہے۔ آفتاب کا وہی آفتاب ہے۔ زمین کے تمام جانداروں کی وہی جان ہے۔ سچا زندہ خدا وہی ہے مبارک وہ جو اس کو قبول کرے +

تیسرا علم کا ذریعہ وہ امور ہیں۔ جو حق الیقین کے مرتبہ پر ہیں۔ اور وہ تمام شدائد اور مصائب اور تکالیف ہیں۔ جو خدا کے نبیوں اور راستبازوں کو مخالفوں کے ہاتھ سے یا آسمانی قضاء و قدر سے پہنچتی ہیں۔ اور اس قسم کے دُکھوں اور تکلیفوں سے وہ تمام شرعی ہدائتیں جو محض علمی طور پر انسان کے دل میں تھیں اس پر وارد ہو کر عملی رنگ میں آجاتی ہیں۔ اور پھر عمل

تیسرا ذریعہ علم کا حق الیقین

کی زمین سے نشو ونما پاکر کمال تام کو پہنچ جاتی ہیں۔ اور عمل کرنے والوں کا اپنا ہی وجود ایک نسخہ مکمل خدا کی ہدایتوں کا ہو جاتا ہے۔ اور وہ تمام اخلاق عفو اور انتقام اور صبر اور رحم وغیرہ جو صرف دماغ اور دل میں بھرے ہوئے تھے۔ اب تمام اعضا کو عملی مزاولت کی برکت سے ان سے حصہ ملتا ہے۔ اور وہ تمام جسم پر وارد ہو کر اپنے نقش ونگار اس پر جما دیتے ہیں۔ جیسا کہ اللہ جلشانہٗ فرماتا ہے۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ٥ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ٥ لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ٥ یعنی ہم تمہیں خوف اور فاقہ اور مال کے نقصان اور جان کے نقصان اور کوشش کے ضائع جانے اور اولاد کے فوت ہونے سے آزمائیں گے۔ یعنی یہ تمام تکلیفیں قضاء وقدر کے طور پر یا دشمن کے ہاتھ سے تمہیں پہنچیں گی۔ سو ان لوگوں کو خوشخبری ہو۔ جو مصیبت کے وقت صرف یہ کہتے ہیں کہ ہم خدا کے ہیں۔ اور خدا کی طرف رجوع کرینگے۔ ان لوگوں پر خدا کا درود اور رحمت ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں۔ جو ہدایت کے کمال تک پہنچ گئے ہیں۔ یعنی محض اس علم میں کچھ شرف اور بزرگی نہیں۔ جو صرف دماغ اور دل میں بھرا ہوا ہو۔ بلکہ حقیقت میں علم وہ ہے۔ کہ دماغ سے اتر کر تمام اعضاء اس سے متادب اور رنگین ہو جائیں۔ اور حافظہ کی یادداشتیں عملی رنگ میں دکھائی دیں۔ سو علم کے مستحکم کرنے اور اس کے ترقی دینے کا یہ بڑا ذریعہ ہے۔ کہ عملی طور پر اس کے نقوش اپنے اعضاء میں جمالیں۔ کوئی ادنےٰ علم بھی عملی مزاولت کے بغیر اپنے کمال کو نہیں پہنچتا۔ مثلاً مدت دراز سے ہمارے علم میں یہ بات ہے۔ کہ روٹی پکانا نہایت ہی سہل بات ہے

اور اس میں کوئی زیادہ باریکی نہیں۔ صرف اتنا ہے۔ کہ آٹا گوندھ کر اور نقدر ایک ایک روٹی کے اس آٹے کے پیڑے بناویں۔ اور اُن کو دونوں ہاتھوں کے باہم ملانے سے چوڑے کر کے توے پر ڈال دیں۔ اور اِدھر اُدھر پھیر کر اور آگ پر سینک کر رکھ لیں۔ روٹی پک جائیگی۔ یہ تو ہماری صرف علمی لاف و گذاف ہے۔ لیکن جب ہم ناتجربہ کاری کی حالت میں پکانے لگیں گے۔ تو اول تو ہم پر یہی مصیبت پڑیگی۔ کہ آٹے کو اس کے مناسب قوام پر رکھ سکیں بلکہ یا تو پتھر سا رہے گا۔ اور یا پتلا ہو کر گلگلوں کے لائق ہو جائے گا۔ اور اگر مر کر اور کھٹ کھٹ کر گوندھ بھی لیا۔ تو روٹی کا یہ حال ہو گا۔ کہ کچھ جلیگی! اور کچھ کچی رہیگی بیچ میں ٹکیا رہیگی۔ اور کئی طرف سے کان نکلے ہوئے ہونگے۔ حالانکہ پچاس برس تک ہم پکتی ہوئی دیکھتے رہے۔ غرض مجرد علم کی شامت سے جو عملی مشق کے نیچے نہیں آیا۔ کئی سیر آٹے کا نقصان کر دینگے۔ پھر جبکہ ادنی ادنی سی بات میں ہمارے علم کا یہ حال ہے تو بڑے بڑے امور میں بجز عملی مزاولت اور مشق کے صرف علم پر کیونکر بھروسہ رکھیں۔ سو خدا تعالے ان آیتوں میں یہ سکھلاتا ہے کہ جو مصیبتیں میں تم پر ڈالتا ہوں وہ بھی علم اور تجربہ کا ذریعہ ہیں یعنی ان سے تمہارا علم کامل ہوتا ہے اور پھر آگے فرماتا ہے۔ کہ تم اپنے مالوں اور جانوں میں بھی آزمائے جاؤ گے۔ لوگ تمہارے مال لوٹینگے تمہیں قتل کرینگے اور تم یہودیوں اور عیسائیوں اور مشرکوں کے ہاتھ سے بہت ہی ستائے جاؤ گے وہ بہت کچھ ایذا کی باتیں تمہارے حق میں کہینگے پس اگر تم صبر کرو گے۔ اور بیجا باتوں سے بچو گے۔ تو یہ ہمت اور بہادری کا کام ہو گا۔ ان تمام آیات کا مطلب یہ ہے۔ کہ بابرکت علم وہی ہوتا ہے۔ جو عمل کے مرتبہ میں اپنی چمک دکھاوے اور منحوس علم وہ ہے جو صرف علم کی حد تک رہے کبھی عمل تک نوبت نہ پہنچے۔

جاننا چاہیئے۔ کہ جس طرح مال تجارت سے بڑھتا ہے اور پھولتا ہے ایسا ہی علم عملی مزاولت سے اپنے روحانی کمال کو پہنچتا ہے۔ سو علم کو کمال تک پہنچانے

کا بڑا ذریعہ عملی مزاولت ہے۔ مزاولت سے علم میں نور آجاتا ہے۔ اور یہ بھی سمجھو کہ علم کا حق الیقین کے مرتبہ تک پہنچنا اور کیا ہوتا ہے۔ یہی تو ہے۔ کہ عملی طور پر ہر ایک گوشہ اس کا آزمایا جائے۔ چنانچہ اسلام میں ایسا ہی ہوا۔ جو کچھ خدا تعالےٰ نے قرآن کے ذریعہ سے لوگوں کو سکھایا۔ ان کو یہ موقعہ دیا۔ کہ عملی طور پر اس تعلیم کو چمکاویں۔ اور اس کے نور سے پُر ہو جاویں۔ اسی غرض سے خدا تعالےٰ نے ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی سوانح کو دو حصوں پر منقسم کر دیا۔ ایک حصّہ دُکھوں اور مصیبتوں اور تکلیفوں کا اور دوسرا حصّہ فتحیابی کا۔ تا مصیبتوں کے وقت میں وہ خلق ظاہر ہوں۔ جو مصیبتوں کے وقت ظاہر کرتے ہیں۔ اور فتح اور اقتدار کے وقت میں وہ خلق ثابت ہوں۔ جو بغیر اقتدار کے ثابت نہیں ہوتے۔ سو ایسا ہی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے دونوں قسم کے اخلاق دونوں زمانوں اور دونوں حالتوں کے وارد ہونے سے کمال وضاحت سے ثابت ہو گئے۔ چنانچہ وہ مصیبتوں کا زمانہ جو ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم پر تیرہ برس تک مکہ معظمہ میں شامل حال رہا۔ اس زمانہ کی سوانح پڑھنے سے نہایت واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے وہ اخلاق جو مصیبتوں کے وقت کامل راستباز کو دکھلانے چاہئیں۔ یعنی خدا پر توکل رکھنا اور جزع فزع سے کنارہ کرنا۔ اور اپنے کام میں سُست نہ ہونا اور کسی کے رُعب سے نہ ڈرنا۔ ایسے طور پر دکھلا دیئے۔ جو کفار ایسی استقامت کو دیکھ کر ایمان لائے اور شہادت دی کہ جب تک کسی کا پورا بھروسہ خدا پر نہ ہو۔ تو اس استقامت اور اس طور سے دُکھوں کی برداشت نہیں کر سکتا ٭

اور پھر جب دوسرا زمانہ آیا۔ یعنی فتح اور اقتدار اور ثروت کا زمانہ تو اس زمانہ میں بھی آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے اعلےٰ اخلاق عفو اور سخاوت اور شجاعت کے ایسے کمال کے ساتھ صادر ہوئے۔ جو ایک گروہ کثیر کفار کا انہی اخلاق کو دیکھ کر ایمان لایا۔ دُکھ دینے والوں کو بخشا اور شہر سے

نکالنے والوں کو امن دیا۔ ان کے محتاجوں کو مال سے مالامال کر دیا۔ اور قابو پا کر اپنے بڑے بڑے دشمنوں کو بخش دیا۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے آپ کے اخلاق و دیکھ کر گواہی دی۔ کہ جب تک کوئی خدا کی طرف سے اور حقیقۃً راستباز نہ ہو یہ اخلاق ہرگز دکھا نہیں سکتا۔ یہی وجہ ہے۔ کہ آپ کے دشمنوں کے پرانے کینے یک لخت دور ہو گئے۔ آپ کا بڑا بھاری خلق جس کو آپ نے ثابت کر کے دکھلا دیا۔ وہ خلق تھا۔ جو قرآن شریف میں ذکر فرمایا گیا ہے اور وہ یہ ہے قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔ یعنی انکو کہہ دے۔ کہ میری عبادت اور میری قربانی اور میرا مرنا اور میرا جینا خدا کی راہ میں ہے یعنی اس کا جلال ظاہر کرنے کے لئے اور نیز اس کے بندوں کے آرام دینے کے لئے ہے۔ تا میرے مرنے سے ان کو زندگی حاصل ہو۔ اس جگہ جو خدا کی راہ میں اور بندوں کی بھلائی کے لئے مرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے کوئی یہ خیال نہ کرے۔ کہ آپ نے نعوذ باللہ جاہلوں یا دیوانوں کیطرح درحقیقت خودکشی کا ارادہ کر لیا تھا۔ اس وہم سے کہ اپنے تئیں کسی آلۂ قتل کے ذریعہ سے ہلاک کر دینا اوروں کو فائدہ پہنچائے گا بلکہ آپ ان بیہودہ باتوں کے سخت مخالف تھے اور قرآن شریف ایسی خودکشی کے مرتکب کو سخت مجرم اور قابل سزا ٹھہراتا ہے۔ جیسا کہ فرماتا ہے۔ وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّہْلُکَۃِ۔ یعنی خودکشی نہ کرو۔ اور اپنے ہاتھوں سے اپنی موت کے باعث نہ ٹھہرو۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اگر مثلاً خالد کے پیٹ میں درد ہو۔ اور زید اس پر رحم کر کے اپنا سر پھوڑ لے۔ تو زید نے خالد کے حق میں کوئی نیکی کا کام نہیں کیا۔ بلکہ اپنے سر کو احمقانہ حرکت سے ناحق پھوڑا۔ نیکی کا کام تب ہوتا۔ کہ جب زید خالد کی خدمت میں مناسب اور مفید طریق کے ساتھ سرگرم رہتا۔ اور اس کے لئے عمدہ دوائیں میسر کرتا۔ اور طبابت کے قواعد کے موافق اس کا علاج کرتا۔ مگر اس کے سر کے پھوٹنے سے زید کو تو کوئی فائدہ نہ پہنچا۔ ناحق اس نے اپنے وجود کے ایک شریف عضو

کو دُکھ پہنچایا۔ غرض اس آیت کا مطلب یہ ہے۔ کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے واقعی ہمدردی اور محنت اُٹھانے سے بنی نوع کی رہائی کے لئے جان کو وقف کر دیا تھا۔ اور دُعا کے ساتھ اور تبلیغ کے ساتھ اور ان کے جور و جفا اٹھانے کے ساتھ اور ہر ایک مناسب اور حکیمانہ طریق کے ساتھ اپنی جان اور اپنے آرام کو اس راہ میں فدا کر دیا تھا۔ جیسا کہ اللہ جلشانہ فرماتا ہے۔ لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرَاتٍ۔ کیا تو اس غم اور اس سخت محنت میں جو لوگوں کے لئے اٹھا رہا ہے۔ اپنے تئیں ہلاک کر دے گا۔ اور کیا ان لوگوں کیلئے جو حق کو قبول نہیں کرتے۔ تو حسرتیں کھا کھا کر اپنی جان دے گا۔ سو قوم کی راہ میں جان دینے کا حکیمانہ طریق یہی ہے۔ کہ قوم کی بھلائی کے لئے قانونِ قدرت کے مفید راہوں کے موافق اپنی جان پر سختی اُٹھاویں۔ اور مناسب تدبیروں کے بجا لانے سے اپنی جان ان پر فدا کر دیں۔ نہ یہ کہ قوم کو سخت بلا یا گمراہی میں دیکھ کر اور خطرناک حالت میں پا کر اپنے سر پر پتھر مار لیں۔ یا دو تین رتی اسٹرکنیا کھا کر اس جہان سے رخصت ہو جائیں۔ اور پھر گمان کریں۔ کہ ہم نے اپنی اس حرکت بیجا سے قوم کو نجات دیدی ہے۔ یہ مردوں کا کام نہیں ہے۔ زنانہ خصلتیں ہیں۔ اور بے حوصلہ لوگوں کا ہمیشہ سے یہی طریق ہے کہ مصیبت کو قابل برداشت نہ پا کر جھٹ پٹ خود کشی کیطرف دوڑتے ہیں۔ ایسی خود کشی کی گو بعد میں کتنی ہی تاویلیں کی جائیں۔ مگر یہ حرکت بلاشبہ عقل اور عقلمندوں کا ننگ ہے۔ مگر ظاہر ہے۔ کہ ایسے شخص کا صبر اور دشمن کا مقابلہ نہ کرنا معتبر نہیں ہے۔ جس کو انتظام کا موقع ہی نہیں ملا۔ کیونکہ کیا معلوم ہے۔ کہ اگر وہ انتقام پر قدرت پاتا تو کیا کچھ کرتا۔ جب تک انسان پر وہ زمانہ نہ آوے۔ جو ایک مصیبتوں کا زمانہ اور ایک مقدرت اور حکومت اور ثروت کا زمانہ ہو۔ اس وقت تک اس کے سچے اخلاق ہرگز ظاہر نہیں ہو

سکتے۔ صاف ظاہر ہے کہ جو شخص صرف کمزوری اور ناداری اور بے اقتداری کی حالت میں لوگوں کی ماریں کھاتا مر جاوے اور اقتدار اور حکومت اور ثروت کا زمانہ نہ پاوے۔ اس کے اخلاق میں سے کچھ بھی ثابت نہ ہوگا۔ اور اگر کسی میدان جنگ میں حاضر نہیں ہؤا۔ تو یہ بھی ثابت نہ ہوگا کہ وہ دل کا بہادر تھا۔ یا بزدل ہوگا۔ اس کے اخلاق کی نسبت ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ہم نہیں جانتے ہمیں کیا معلوم ہے۔ کہ اگر وہ اپنے دشمنوں پر قدرت پاتا۔ تو ان سے کیا سلوک بجا لاتا۔ اور اگر وہ دولت مند ہو جاتا۔ تو اس دولت کو جمع کرتا یا لوگوں کو دیتا۔ اور اگر وہ کسی میدان جنگ میں آتا۔ تو دُم دبا کر بھاگ جاتا۔ یا بہادروں کی طرح ہاتھ نہ دکھاتا۔ مگر خدا کی عنایت اور فضل نے ہمارے نبی صلے اللہ علیہ وسلم کو ان اخلاق کے ظاہر کرنے کا موقع دیا۔ چنانچہ سخاوت اور شجاعت اور حلم اور عفو اور عدل اپنے اپنے موقع پر ایسے کمال سے ظہور میں آئے۔ کہ صفحہ دُنیا میں اس کی نظیر ڈھونڈنا لاحاصل ہے۔ اپنے دونوں زمانوں ضعف اور قدرت اور ناداری اور ثروت میں تمام جہان کو دکھلا دیا۔ کہ وہ ذات پاک کس اعلے درجہ کے اخلاق کی جامع تھی۔ اور کوئی انسانی خلق اخلاق فاضلہ میں سے ایسا نہیں ہے۔ جو اس کے ظاہر ہونے کے لئے آپ کو خدا تعالے نے ایک موقعہ نہ دیا۔ شجاعت۔ سخاوت۔ استقلال۔ عفو۔ حلم وغیرہ وغیرہ تمام اخلاق فاضلہ ایسے طور پر ثابت ہو گئے۔ کہ دنیا میں اسکی نظیر کا تلاش کرنا طلب محال ہے۔ ہاں یہ سچ ہے۔ کہ جنہوں نے ظلم کو انتہا تک پہنچا دیا۔ اور اسلام کو نابود کرنا چاہا۔ خدا نے ان کو بھی بے سزا نہیں چھوڑا۔ کیونکہ ان کو بے سزا چھوڑنا گویا راستبازوں کو ان کے پیروں کے نیچے ہلاک کرنا تھا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی لڑائیوں کی ہرگز یہ غرض نہ تھی۔ کہ خواہ نخواہ لوگوں کو قتل کیا جائے۔ وہ اپنے باپ دادا کے ملک سے نکالے گئے تھے۔ اور بہت سے مسلمان مرد اور عورتیں بے گناہ شہید کئے گئے تھے۔ اور ابھی ظالم ظلم سے باز نہیں آتے تھے۔ اور اسلام کی تعلیم کو

روک سکتے تھے۔ لہذا خدا کے قانونِ حفاظت نے چاہا۔ کہ مظلوموں کو بالکل نابود
ہونے سے بچالے۔ جنہوں نے تلوار اُٹھائی تھی۔ انہی کے ساتھ تلوار کا مقابلہ
ہوا۔ غرض قتل کرنے والوں کا فتنہ فرو کرنے کے لئے بطور مدافعت
شر کے وہ لڑائیاں تھیں۔ اور اس وقت ہوئیں۔ جب کہ ظالم طبع لوگ اہل
حق کو نابود کرنا چاہتے تھے۔ اس حالت میں اگر اسلام اس حفاظت خود اختیاری
کو عمل میں نہ لاتا۔ تو ہزاروں بچے اور عورتیں بے گناہ قتل ہو کر آخر اسلام
نابود ہو جاتا۔ یاد رہے۔ کہ ہمارے مخالفین کی یہ بڑی زبردستی ہے۔ کہ وہ خیال
کرتے ہیں۔ کہ الہامی ہدایت ایسی ہونی چاہیئے۔ جس کے کسی مقام اور کسی محل
میں دشمنوں کے مقابلہ کی تعلیم نہ ہو۔ اور ہمیشہ حلم اور نرمی کے پیرایہ میں اپنی
محبت اور رحمت ظاہر کرے۔ ایسے لوگ اپنی دانست میں خدائے عزّوجل
کی بڑی تعظیم کر رہے ہیں۔ جو اس کی تمام صفات کاملہ کو صرف نرمی اور
ملائمت پر ہی ختم کرتے ہیں۔ لیکن اس معاملہ میں فکر اور غور کرنے
والوں پر آسانی سے کھل سکتا ہے۔ کہ یہ لوگ بڑی موٹی اور فاش
غلطی میں مبتلا ہیں۔ خدا کے قانونِ قدرت پر نظر ڈالنے سے صاف
ثابت ہوتا ہے۔ کہ دُنیا کے لئے وہ رحمت محض تو ضرور ہے۔ مگر
وہ رحمت ہمیشہ اور ہر حال میں نرمی اور ملائمت کے رنگ میں ظہور پذیر نہیں
ہوتی۔ بلکہ وہ سراسر رحمت کے تقاضا سے طبیب حاذق کی طرح کبھی
شربت شیریں ہمیں پلاتا ہے۔ اور کبھی دوائی تلخ دیتا ہے۔ اس کی رحمت
نوع انسان پر اس طرح وارد ہوتی ہے۔ جیسے ہم میں سے ایک شخص اپنے تمام
وجود پر رحمت رکھتا ہے۔ اس بات میں کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔ کہ ہر ایک
فرد ہم میں سے اپنے سارے وجود سے پیار رکھتا ہے اور اگر کوئی ہمارے
ایک بال کو اکھاڑنا چاہے تو ہم اس پر سخت ناراض ہوتے ہیں۔ لیکن باوصف اس
کے کہ ہماری محبت جو ہم اپنے وجود سے رکھتے ہیں۔ ہمارے تمام وجود

میں بٹی ہوئی ہے۔ اور تمام اعضاء حقیقت میں ہمارے لئے پیارے ہیں۔ ہم
کسی کا نقصان نہیں چاہتے۔ مگر پھر بھی یہ بات بیداہت ثابت ہے۔ کہ
ہم اپنے تمام اعضاء سے ایک ہی درجہ کی اور یکساں محبت نہیں رکھتے
بلکہ اعضائے رئیسہ و شریفہ کی محبت جن پر ہمارے مقاصد کا بہت کچھ
مدار ہے۔ ہمارے دلوں پر غالب ہوتی ہے۔ ایسا ہی ہماری نظر میں ایک
ہی عضو کی محبت کی نسبت مجموعۂ اعضاء کی محبت بہت بڑھ کر ہوتی ہے
پس جب کبھی ہمارے لئے کوئی ایسا موقع آپڑتا ہے۔ کہ ایک شریف
عضو کا بچاؤ ادنےٰ درجہ کے عضو کے زخمی کرنے یا کاٹنے یا توڑنے پر موقوف
ہوتا ہے۔ تو ہم جان کے بچانے کے لئے بلا تامل اسی عضو کے زخمی کرنے
یا کاٹنے پر مستعد ہو جاتے ہیں۔ اور گو اس وقت ہمارے دل میں
یہ رنج بھی ہوتا ہے۔ کہ ہم اپنے ایک پیارے عضو کو زخمی کرتے بلکہ کاٹتے
ہیں۔ مگر اس خیال سے کہ اس عضو کا فساد کسی دوسرے شریف
عضو کو بھی ساتھ ہی تباہ نہ کرے۔ ہم کاٹنے کے لئے مجبور ہو جاتے
ہیں۔ پس اسی مثال سے سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ خدا بھی جب دیکھتا ہے
کہ اس کے راستباز باطل پرستوں کے ہاتھ سے ہلاک ہوتے ہیں۔
اور فساد پھیلتا ہے۔ تو راستبازوں کی جان کے بچاؤ اور رفع فساد
کے فرد کرنے کے لئے مناسب تدبیر ظہور میں لاتا ہے۔ خواہ آسمان
سے خواہ زمین سے اس لئے کہ وہ جیسا کہ رحیم ہے۔ ویسا ہی حکیم بھی ہے

الحمد للہ رب العلمین۔